U1
EL09M

مقامات

احسان دانش

مکتبۂ دانش مزنگ لاہور

قیمت تین روپے

انتباہ

احسان دانش

نذر

میرے خیال سے جہاں ڈاکٹر اقبال مرحوم کے کلام، علّامہ عنایت اللہ خاں
مشرقی کے عمل، مولانا حسرت موہانی کی مخلصانہ خدمات اور مولینا عبیداللہ سندھی
رحمۃ اللہ علیہ کی روحانی تڑپ اور تجاویز و عزائم کا تعلق شاہ ولی اللہ رح کی
سیاسی تحریک اور اصولِ حیات سے ہے۔ وہیں شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں
کے حیات پرور ایثار و انہماک کو بھی اسی کے ایک اہم شعبہ کی تعمیر
سمجھتا ہوں اور ان کی معصوم عظمتوں کے اعتراف میں اپنی کتاب
"مقامات" کو ان کی نذر کرتا ہوں۔

احسان دانش

تقسیمِ ابواب

فہرس

سرِبابؑ

ہر فن کی تزئین و حیات کے علاوہ توسیع و ترقی کے سلسلے میں چراغ سے چراغ جلتا چلا آیا ہے۔ اور دو چیزوں کے ملنے سے ہمیشہ ایک تیسری چیز وجود اختیار کرتی آرہی ہے جس میں بعض اوقات تو اپنے تعمیری اجزاء سے کم اور بعض اوقات زیادہ معائب و محاسن نظر آتے ہیں۔

اگرچہ فطرت کا مشغلہ نشو و نما اور تجدید و تغیر کے سوا انسانی اذہان کی گرفت میں کچھ نہ آسکا لیکن یہ بھی واضح ہے کہ انسان فطری طور پر نقال اور مقلد واقع ہوا ہے اور آج جس قدر ترقیاں ہمیں حیران کئے ہوئے ہیں۔ بیک فکر تمام تر نقل و تقلید کے ساتھ اختراعی طبیعتوں کی عجوبہ کاریاں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی ترقی یافتہ شکلیں ابتدائی ڈھانچوں سے بہت آگے نکل چکیں تاہم ان کی پیشانی سے بنیادی نظریات کے لیبل کون اتار سکتا ہے؟

مثال کے طور پر بیل گاڑی کو دیکھئے جسے تہذیب و تمدن اور حکمت و سائنس نے صرف ان کے موجدوں کی اولاد کی میراث میں چھوڑا ہے ترقی کر کے موٹروں، سائیکلوں، ہوائی جہازوں اور نہ جانے کن کن صبا رفتار اور برق رو مشینریوں کی شکل میں تبدیل ہو گئی۔ مگر کوئی سائنس دان یا انجنیئر اس کے بنیادی نظریہ یعنی پہیہ کی گولائی کو آج تک نظر انداز کر کے مثلث یا چوکور پہیہ بنا کر کام نہ کر سکا۔

بالکل اسی طرح ترقیِ شعر و ادب میں بھی وہی صدیوں کے باقیات عروض، بحور، ردیف اور قافیہ، جنہیں پیشروؤں نے ایجاد کیا تھا ہنوز مستعمل ہیں۔

ؑ "سرِباب" اس لئے شائع کر رہا ہوں یہ شاعر کیلئے قصیدہ نہیں ہے۔ احسانؔ دانش

جدت پسند حضرات نے بیشمار اسلوب وضع کئے اور ترمیم و تنسیخ سے کام لیا۔ لیکن ان کے وضع کردہ اصول یا تو انھیں تک محدود رہ گئے یا عوام تک پہنچتے پہنچتے فنا ہو گئے۔

ولی سے لے کر موجودہ دور تک سب کے سب اُسی قدیم طرز شعر اور کہنہ پیمانہ و اوزان سے تلتے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن جس طرح پیمانے کی ساخت سے شراب کی تاثیر پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور پھول گلی کوچہ کے علاوہ میدان اور طشتری میں بھی پھول ہی رہتا ہے۔ اسی طرح ادب میں بھی ہر ادیب اور شاعر پیشرووں کا مقلد ہونے کے باوصف اپنے رنگ کا آپ خالق ہے اور آنے والی نسلوں کے لئے اپنی ہی سیرت و عمل کے نقوش چھوڑتا ہے۔

جب تک آرٹسٹ خود جینیس نہ ہو اسے شب و روز کی مشق و مزاولت کبھی سرفراز نہیں کر سکتی اور نہ وہ دنیائے مستقبل کے لئے جاذبیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کے یہاں بے شمار مثالیں ایسی ہیں۔ کہ انھوں نے مصنوعی بازوؤں سے پرواز کرنا چاہی مگر جہاں مصنوعات کے اعتبارات کی حدود ختم ہو کر صرف حقائق کی گنجائش رہ جاتی ہے۔ اس فضا میں وہ ایک اُڑان بھی نہ لے سکے۔ اور چشم زدن میں اپنے اور خالص اپنے مقام پر آ گئے۔ چنانچہ ان کا یہ قطعہ کہ ع

نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے[1]

صاف اکبر الہ آبادی کی تقلید ہے اور جہاں گل پژمردہ کے عنوان سے "بشنو از گل چوں حکایت میکنم" کہا ہے اُن کے انداز سے پیر رومی مسکراتے نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی قابل گرفت بات نہیں۔ بلند دماغ خواہ کسی بھی ملک کے ہوں، بلندیوں پر ہی ملتے ہیں اور بیشتر مقامات پر ہمدوش و ہمگام رہتے ہیں۔ شعر و ادب کا مقصد اُلٹی سیدھی "ایجاد بندہ" نہیں بلکہ مغموم دلوں کو مسرور کرنا، شکستہ خاطروں کو زندگی کا پیغام دینا اور بھولے بھٹکوں کو راہ راست

[1] بانگ درا میں ص ۳۲۵ پر ظریفانہ کلام کے تحت

پر لانا اُس کا منشاء ہے۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ جذباتی شاعری جس کا تعلق صرف تفریحِ طبع سے ہے شاعری نہیں۔ میں تو یہ کہوں گا کہ جس ادب کو ادب برائے زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ بھی جذبات ہی کی کرشمہ کاری ہے فرق صرف شدتِ رجحان اور استعداد منازل کا ہے۔

بعض حضرات جذباتی مراحل سے گذر کر زندگی کی رفتار اور مقاصدِ حیات کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں جہاں اُن کے سامنے بے شمار تنقیدی اور اصلاحی پگ ڈنڈیاں چلتی نظر آتی ہیں۔ اور بعض شبابی خیابانوں کو عبور نہیں کر سکتے اور اُن کی حیاتِ شعر قوی کو مضمحل پاکر اسی ماحول میں خودکشی کر لیتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب کا شاعر اُس وقت اور ماحول میں طلوع ہوا ہے جب کہ علامہ اقبالؒ کی ملت نوازی اور حضرت جوش ملیح آبادی کی انقلابی شاعری کا شباب تھا۔

میر انیس اور نظیر اکبر آبادی کے مطالعہ کے بعد احسان دانش پہ ماحول کا جو اثر اصولی طور پر ہونا چاہئیے تھا وہ تو ظاہر ہے مگر اس دور میں احسان سے پہلے کوئی شاعر بھی اقبال اور جوش کی تقلید تو کجا گردِ راہ کو بھی نہ پہنچ سکا تھا۔ لیکن اس کے ذاتی جوہر اور فطری صلاحیتیں ایسی کارفرما ہوئیں کہ یہ ہندوستان بھر میں اپنے ہمعصر شعراء سے کٹ کر زمانہ کی رفتار و مشکلات پر مسکراتا ہوا اپنے پیشرؤوں کی صف میں جا ملا۔ اور اس مردانہ روی سے کہ پرواز میں کوئی گرفت اس کے دامن اور کوئی حادثات کی دلدل اس کے تلوؤں کو آلودہ نہ کر سکی۔

میں جانتا ہوں کہ میری یہ تحریر تاریخِ ادب کا کوئی جزو نہ بن سکے گی۔ کیونکہ مستقبل کا نقاد اپنی ترقی وقت اور قانونِ ارتقا کے لحاظ سے نہ جانے کیا کیا نظریات لے کر آئیگا لیکن اس پر بھی ایمان کی حد تک یقین رکھتا ہوں کہ معیاری ادیب اور حقیقی نقاد متعصب نہیں ہوتا۔ وہ تو بہت سی نقلی تحریروں کے ملمعے اور جعلی سکوں کے جھول اُڑا کر دودھ کو دودھ اور پانی کو پانی کر کے دکھا دیتا ہے اور اس سلسلے میں میرا اس کتاب کو ترتیب دے دینا نقاد کے لئے بہت سی سہولتوں کا باعث ہوگا۔ کیونکہ احسان دانش نے مجھے اپنی بیاض "نشانِ منزل" کے نام سے ترتیب کے لئے سپرد کی تھی لیکن جب میں نے کلام پر نظر ڈالی تو اسلوب کے لحاظ سے مجھے اس کے

تین حصے کر دینا پڑے اور میں اس معمولی سی کاوش کے بعد ان تینوں مجموعوں کو "نوائے کارگر" جلد دوم "چراغاں" جلد دوم اور "جادہ نو" جلد دوم کے نام سے شائع کرنا چاہتا تھا مگر مصنف کی رائے سے پہلا حصہ "مقامات" دوسرا "شیرازہ" اور تیسرا "زخم و مرہم" کے نام سے شائع کر رہا ہوں۔

احسان دانش کے کلام میں جہاں نظیر اکبر آبادی اور میر انیس کی روحیں بولتی نظر آتی ہیں وہیں علامہ اقبال اور جوش ملیح آبادی کے اسلوب بھی پر تو فشاں ہیں جو وقتی اور عصری تقدیم و تاخیر کے لحاظ سے اصولی طور پر ضروری ہیں۔

احسان کے مطبوعہ کلام "نفیر فطرت"۔ "نوائے کارگر"۔ "چراغاں"۔ اور "آتش خاموش" میں بھی مقاماتی رنگ موجود ہے۔ اور اگر اس قسم کی تمام نظمیں ایک جا ہو جاتیں تو مقامات کی وسعتوں میں اضافہ ہو جاتا مگر کچھ تو مطبوعہ سمجھ کر نظر انداز کر دی گئیں۔ اور کچھ احسان نے اس تجزیہ کو وقعت نہ دی۔

کاغذ کی قلت کے باعث "مقامات" کی کچھ نظمیں "شیرازہ" میں شامل کرتے ہوئے اگرچہ تکلیف ہوئی۔ لیکن جنگ کے اثرات اور وقت کے تقاضے سے کون بچ سکتا تھا۔

احسان اور اس کی شاعری کے متعلق کچھ لکھ کر نہ تو عام دیباچہ نگاروں کی صف میں آنا میری مراد ہے اور نہ احسان کی طرف سے معتوب ہونا چاہتا ہوں زمانہ بے لاگ نقاد اور مذاقِ سلیم بہترین کسوٹی ہے اور بس۔

محمد توقیر طاہر گنگوہی

طاقِ حرم

محراب

الٰہی صدقۂ سالارِ کونین
مجھے بیدارئ تقدیر دے دے!
جنوں ہے خدمتِ انساں کا مجھکو
کمالِ خامہ و شمشیر دے دے
عطا کر دل کو استحکامِ حیدرؓ
وفا کو غیرتِ شبیرؓ دے دے
زباں کو راستی کی بھیک دے کر
مرے ہر لفظ میں تاثیر دیدے

حضورِ سرورِ کائناتؐ

مری کاوشِ نظر نے مرے ذوقِ معتبر نے
بہ کمالِ فکر دیکھی یہ حقیقتِ درخشاں
تو ہجومِ دو جہاں میں ہے وہ پیکرِ محاسن
ہوئی جس میں آکے مدغم ہمہ کائناتِ یزداں
تجھے پیشکش بتایا ہے شبابِ ارتقا نے
تری پیشکش کے قرباں تری پیشکش ہے قرآں

پیمانۂ قانون

مذہب سے عداوت ہے، حکومت سے بغاوت
افسوس بصارت نہیں رکھتے یہ اراکین

تقسیمِ تمدّن سے ہے میرا ابھی جگر چاک
مَیں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ دَر پے ہیں شیاطین

لیکن میں حکومت سے مخاطب نہیں ہوتا
ہیں میرے دواوین میں کچھ اور مضامین

دولت کے نشے میں اسے سمجھے ہیں بہت کم
تاریخ کی فہرست کے مرحوم سلاطین

ہے اصل میں انساں کا مربی وہی حاکم
مذہب سے تراشے جو حکومت کے قوانین

دہریّت اور اسلام

کم نہیں طاعون سے مشرق میں تقلیدِ فرنگ
گرچہ اس میں زندگی کا ظاہری سامان ہے

رُک گئے ہیں جہد و عشرت کے دو راہے پر دماغ
عقلِ دانایانِ مغرب ششدر و حیران ہے

ان میں اکثر عشرتِ امروز پر ہیں کاربند
عشرتِ امروز، جو دو روز کی مہمان ہے

تیرے فردا پر ہے تیری زندگی کا انحصار
تو مسلماں ہے تو تیرا رہنما قرآن ہے

تجھ کو یہ تحقیق کا سودا مبارک ہو مگر
دہریّت دشوار تر ہے عاقبت آسان ہے

مختصر سی زندگی اور دو جہاں کی چھان بین
کاہ سے تا کہکشاں افسانۂ ادیان ہے
مغربی تحقیق سے بالا ہیں اسلامی رموز
دہریت بُرہان اور یہ حاصلِ بُرہان ہے

بہائے دُنیا

قطعہ

ناکامئ تحصیل سے ہے عظمتِ حاصل
ہر مردِ ہُنر مند ہے بیزار ہنر سے
جس دن بھی گئیں تیری حقیقت پہ نگاہیں
گر جائیں گے دُنیا کے مقامات نظر سے

غزل

ایک رُوداد تباہی ہے یہ افسانہ نہ پوچھ
دشمنوں پر غمگساری کا یقیں کیونکر ہوا؟

محوِ حیرت ہوں کہ جب ہر لَے ہے شیون کا پیام
پھر یہ طاؤس و ترانہ دل نشیں کیونکر ہوا؟

تو اگر تقلید کا مومن ہے، مومن ہی نہیں
جس سے آگاہی نہیں وہ تیرا دیں کیونکر ہوا؟

زندگی میں ہنسنے والوں پر تعجب ہے مجھے
پُر سراسر زہر جامِ انگبیں کیونکر ہوا؟

کہہ دیا قرآن نے خوبی سے اس نکتہ کو حل
ایک اُمّی رحمتہ اللعالمیں کیونکر ہوا؟

انجامِ نظر

دوستوں کی آنکھوں سے مول لی ہے بینائی
انجمن سے ڈرتا ہوں، وجہِ غم ہے تنہائی

کائنات میں کوئی دوست ہی نہیں شاید
یا مری بصیرت ہی کھو چکی ہے بینائی

رہنمائی کرتی ہیں تجربات کی شمعیں
عشق ایک خودکامی، حسن اک خود آرائی

اہلِ دل کو کب آیا اعتبار دونوں کا
اک تمام بے دینی، اک تمام رسوائی

دیں ہ ورجنوں دیکھا، ورہیں وفا دیکھی
ہیچ نشّہ و مستی، ہیچ رنگ و زیبائی

حُسن اب بھی تابندہ، عشق آج بھی بیتاب

لیکن اِن فسانوں میں اب نہیں ہے رعنائی

ہر حسیں تبسّم کا اختتام ہے آنسو

ہے ہر اک بلندی کے دامنوں میں گہرائی

رازہائے ہستی کو صرف اُس نے سمجھا ہے

جس کو عرشِ اعظم تک لے گئی جبیں سائی

انکار

خدا کیا؟ عدل کیا؟ پیغمبری کیا؟

بدل جا ہر صداقت سے بدل جا!

مگر انکار کامل ہے تو اے دوست

خدا کے کارخانے سے نکل جا!

غزل

غیر کو ہر گز نہ آگاہِ مزاجِ دل بنا
اپنی اک تصویر لے کر پیار کے قابل بنا

کاوشِ پیہم کو اپنی زیست کا حاصل بنا
تو تو عالم ساز ہے اپنی نئی محفل بنا

کس نے کن نظروں سے دیکھا ہے یہ گلشن کی طرف
مسکرائے پھول ہر ذرّہ دھڑک کر دل بنا

مطمئن ہوں میری کوشش میں کمی کوئی نہیں
یہ رہی قسمت نہ اب تک میں ترے قابل بنا

حال کے سینے میں ماضی کی خلش بھی ہو مگر
دل کی آنکھیں کھول کر فہرستِ مستقبل بنا!

ناخدا کی منّتیں کیسی، خدا پر ناز کر

نظمِ دریا کو بدل دے، موج کو ساحل بنا

اس مصوّر سے کہ ہے ذی روح جس کی ہر لکیر

کس طرح کہہ دوں کہ عالم نقشِ باطل بنا

گرچہ تھی تخلیقِ انساں میں بہت کچھ احتیاط

پھر بھی یہ کمبخت محتاجِ سکونِ دل بنا

مَیں تری دُنیا کا ہم آہنگ ہو سکتا نہیں

مَیں اگر تیرا ہوں دنیا کو مرے قابل بنا

آب و گِل میں مدّتوں آرائشیں ہوتی رہیں

تب کہیں اِک آدمی کونین کا حاصل بنا

ہوش دار اے خاں اتنا ضبطِ غم اچھا نہیں

یُوں تو رازِ عشق، اب افسانۂ محفل بنا

لخت لخت

تھے گدائی میں بھی جس کے شب و روز خسروانہ
مجھے غفلتوں میں پایا کہ وہ گزر گیا زمانہ

نہ قیامِ فصلِ گل کو نہ خزاں ہے جاودانہ
یہ عجیب زندگی ہے نہ قفس نہ آشیانہ

کسی بے کس و حزیں کا نہیں تو اگر معاون
ترا اتّقا کہانی، تیری منصفی فسانہ

ہیں جنونِ معصیت میں بھی عبودیّت کی راہیں
مگر اب کے رہروؤں میں نہیں جذبِ عارفانہ

ترے ارتکابِ عصیاں میں ہے موتِ آرزو کی
یہی خونِ آرزو ہے ترا فعلِ مجرمانہ

مری زندگی میں افضل ترے درد کی ضرورت

ترے درد کی ضرورت مرا ذوقِ والہانہ

ہیں شریف مفلسوں کی وہ کراہتی نگاہیں

کوئی آہ صبحگاہی، کوئی نالۂ شبانہ

مجھے میکشانِ مغرب نہ بلائیں میکدے میں

مرے ظرفِ زندگی میں ہے ابھی مئے شبانہ

مرے سامنے ازل کی کوئی انجمن نہیں ہے

مرے روبرو ہے فردا، مری زد پہ ہے زمانہ

مَیں جما رہا ہوں تنکے مگر اس سے بے خبر ہوں

یہ قفس کی طرح تو ہے کہ بنائے آشیانہ

غمِ عشق و فاقہ مستی، زر و غربت و محبّت

بہت ان کسوٹیوں پر مجھے کس چکا زمانہ

مرے واقعات ہیں ہے مری زندگی کی قیمت
مری عمرِ مختصر کا یہ ہے مستند فسانہ
مَیں جنونِ جستجو ہوں تُو غرورِ پردہ داری
مَیں تمام تر حقیقت، تُو تمام تر فسانہ

مقامِ جنوں

جنونِ عاشقی اللہ اکبر
بصیرت آفریں یہ سرزمیں ہے
یہاں آواز دیتے ہیں معارف
کہ آ جاؤ سکونِ دل یہیں ہے

ایک پیشہ ور پیر کی بارگاہ میں

اگر ہے ذاتِ باری تک رسائی
تو جھوٹا ہے جنونِ رہنمائی
خدا آگاہ اور یہ ہوش و اِدراک
تجارت ہے تجارت پارسائی
فقیری ہو کہ سجّادہ نشینی
ہیں سب طرز و تراشِ خود نمائی

خُدا دے نوجوانوں کو بصیرت
مقامر کر رہے ہیں پیشوائی!!

غزل

وفا سے بیزار ہو چکا ہوں کہ احترامِ وفا نہیں ہے

اس آئینے کو شکست کر دو یہ آئینہ آئینہ نہیں ہے

بڑی بڑی پائمالیوں سے یہ راز کھلتا ہے اہلِ دل پر

غمِ محبّت نہیں میسّر تو زندگی کا مزا نہیں ہے،

حریمِ روحِ جمال تک ہے رسائی لے دے کے صرف دل کی

تعیّناتی حدوں سے آگے نگاہ کا راستہ نہیں ہے

تڑپ سکے جس قدر تڑپ لے مگر ذرا یہ خیال رکھنا!

کہ جو ترا مدّعا ہے اے دل وہ عشق کا مدّعا نہیں ہے

غلط، کہ تبدیل ہو چکا ہے جنوں سے میری نظر کا مرکز

ابھی تو اپنی جگہ ہے دنیا ابھی تو ایسا ہوا نہیں ہے

ہزار دل نے فریب کھائے ہزار جلوے نظر پہ ٹوٹے
مگر ابھی تک ہے ہوش اتنا، بشر بشر ہے خدا نہیں ہے

ہر اک بلندی کا بار ہستی لئے ہوئے دوش پر کھڑی ہے
گزرنے والے گذر رہے ہیں مگر کوئی دیکھتا نہیں ہے

بساطِ گردوں پہ ماہ و انجم، زمیں کے دامن میں لالہ و گل
تجلّیاں سی تجلّیاں ہیں کہ ہوشِ عالم بجا نہیں ہے

مرے سفینے کو جوشِ طوفاں جدھر بہائے اُدھر بہا دے
مجھے تلاشِ خدا ہے آخر نہ ہو اگر ناخُدا نہیں ہے

غمِ دو عالم خدا کے شایاں، غمِ زمانہ سے خوش زمانہ
زہے غمِ ارزانیٔ محبّت، مجھے غمِ ماسوا نہیں ہے

ہزار نامہرباں سہی تو میں ایسا محسوس کر رہا ہوں
تمام دُنیا میں جیسے کوئی ترے سوا آسرا نہیں ہے

رہِ وفا میں جہاں سے مُڑتا ہے راستہ دل کی وادیوں کو
وہیں سے ہے سلطنت جنوں کی وہاں خرد رہنما نہیں ہے
حسین چہروں کی آڑ لے کر جنوں کو آواز دینے والے!
نگاہ سے ماوریٰ ابھی تو شعور سے ماوریٰ نہیں ہے
غمِ محبت سے دُور ہٹ کر بھی سینکڑوں مشکلیں ہیں لیکن
وہ آنسوؤں میں نمک نہیں ہے وہ تلخیوں میں مزا نہیں ہے
مرے مصائب تو ہر نفس پر ترے کرم ہی سے مطمئن ہیں
وہ لوگ کس طرح جی رہے ہیں جنہیں ترا آسرا نہیں ہے
بجا کہ احسانِ نامرادی اُمید کی اک سزا ہے لیکن
خدا مرے دوستوں کو رکھے کہ دشمنوں سے گلہ نہیں ہے

اخلاق

اخلاق ہے گو فکر و تخیّل کا نتیجہ
آج اس کے معابد ہیں ہیں اصنام خیالی
اصنامِ خیالی کی پرستش بھی غلط ہے
ناقص ہے پرستش تو پجاری بھی ہے خالی
اخلاق تو وہ نسخۂ اکسیر ہے جس میں
کچھ جراءتِ اعمال ہے، کچھ ہمّتِ عالی
اس معملِ ہستی سے جو نکلے ہیں سنور کر
وہ عفو سے عاری ہیں نہ شمشیر سے خالی
تاریخ کے ماتھے پہ درخشاں ہیں ابھی تک
اذکارِ حسینؓ و اویسیؓ و بلالیؓ

مکین و مکان

لاہور کے گورستان میں جہاں سے آبادی کے خدوخال نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ احسان

کیا کروں اے دوست مرگ و زندگی پہ گفتگو
کھے نہیں سکتی حقائق کے سفینوں کو زباں
یہ ہے گورستان، وہ محلوں کا بے پایاں ہجوم
درمیاں دونوں کے نامعلوم سی اک داستاں
یہ مسائل کون سمجھائے بقیدِ آب و گِل
صرف اتنا دیکھ لے یہ ہیں مکیں وہ ہیں مکاں

تشکیک

اس دور کے افراد کو تشکیک نے کھویا
تسکین میسّر ہے نہ ہاں سے نہ نہیں سے
مغرب کے فسوں ساز ہیں احساس کے دشمن
ہر شعلۂ تخریب لپکتا ہے وہیں سے
تقدیر میں ہندی کی نہ امروز نہ فردا
تقلید نے پھینکا ہے اسے چرخ بریں سے
تفریق کا بیمار، مساوات سے پرہیز
اے کاش یہ نسخہ اسے مل جائے کہیں سے
مذہب کے خدو خال نظر آتے ہیں اس وقت
اٹھتا نہیں جس وقت دھواں شمع یقیں سے

آثار و علامات

برسوں سے یہ شاعر کی نظر دیکھ رہی ہے

انصاف میں اندھیر، حکومت میں ہنی مون!

چہروں پہ مذاہب کے ہیں آثارِ علالت

الحاد کی مٹی میں روایات ہیں مدفون!

تقسیم و حکومت کی ہے تخلیق یہ ماحول

اجزائے معاصی ہی سے بنتی ہے یہ معجون!

لیکن جو نظر آتی ہے مشرق میں ہلاکت

مغرب کے لئے بھی یہی طاعون ہے طاعون!

اُس ملک کی تقدیر ہے پسپائی و پستی

بولے نہ جہاں حکمت و انصاف سے قانون!

غزل

مٹا دیا جسے سیلابِ نامرادی نے
وہی بساط، وہی دورِ جام پیدا کر

تری تڑپ ہی تب و تابِ زندگانی ہے
مجاہدوں کے دیاروں میں نام پیدا کر

نئے کلیم ہیں درکار طورِ نو کے لئے
نئے جہاں میں نئے صبح و شام پیدا کر

یہ وادیوں کے فسانے ہیں کرمکِ شب تاب
بلندیوں پہ گرج کر دوام پیدا کر

مجھے یہ ضد ہے کہ ہو عام ذوقِ آزادی
غلام چیخ رہے ہیں غلام پیدا کر

خودی و خودپسندی

اُف رے خامۂ فطرت بہ سلیقۂ ترتیب
ٹوٹتی نہیں نسبت پستی و بلندی کی
دو گروہ انساں ہیں منکرین و پیغمبر
ایک جلوے خودی کی ہے ایک خودپسندی کی

پست بلندیاں

اسرارِ عناصر ہیں بے پردہ کسی حد تک
مائل بہ ترقی ہے اندیشۂ انسانی،
لیکن مری نظروں میں ہر لحظہ فراواں ہے
افکار کی ناداری، ارواح کی ویرانی،
فاقوں میں غریبوں کے ترمیم نہیں ہوتی
سینوں میں اندھیرے ہیں آنکھوں میں درخشانی،
قوموں کے دفاتر میں ڈھونڈے سے نہیں ملتے
اسلوبِ جہانگیری، آئینِ جہانبانی،
کیا جانے تمدن کو کس گھاٹ اُتارے گی
تعلیم کی گمراہی، دولت کی فراوانی،

تہذیبی اثرات

ہوں اغیار کیوں ہند سے دل شکستہ

ہیں کالج مذاہب کی قربان گاہیں

شعور و خرد ڈھل چکے حیرتوں میں

مٹیں حق پہ، یا حُسنِ باطل کو چاہیں

چراغِ یقیں ہے بگولوں کی زَد پر

بصیرت کو روتی ہیں دل کی نگاہیں

شفا گاہِ تہذیب ہے اُن سے خالی

جو ہنس کھیل کر دھر بپا نہ چاہیں

تمدن سے، فیشن سے، تعلیمِ نَو سے

بہر سُو ہیں روشن تباہی کی راہیں

رازونیاز

گذاری ہے شروعِ عشق میں یوں زندگی ہم نے
اڑائی ہے گرجتے انقلابوں کی ہنسی ہم نے

ہمیں مستی بھی حاصل ہے ہمیں ہستی بھی حاصل ہے
کیا ہے بے خودی کے ساتھ پیمانِ خودی ہم نے

پکارا حسن نے آواز دی بڑھ بڑھ کے دولت نے
اٹھا کر آنکھ دیکھا بھی نہ دنیا کو کبھی ہم نے

کوئی پوچھے امیرِ کارواں کی کیا خطا اس میں
سفر میں کیوں کمرِ منزل سے پہلے کھول دی ہم نے

ابھی انسان کی آنکھوں سے اوجھل ہے مقام اپنا
ابھی دیکھا نہیں ہے زندگی کو زندگی ہم نے

بتوں میں تیرے جلوے دیکھ کر کرلی ہیں بند آنکھیں
روا رکھی نہ ترمیم طریقِ بندگی ہم نے

ہمیں کو حق پہنچتا ہے تری چشمِ عنایت کا
کہ ڈالی ہے تیری عظمت پہ اب تک روشنی ہم نے

گماں ہونے لگا پروردگارِ آدمیّت کا
بلند اتنا کیا اپنا مذاقِ بندگی ہم نے

ارے او باعثِ جوشِ بغاوت پُوچھنے والے
کبھی دیکھا ہے اپنی زندگی کو زندگی ہم نے!

ضمیرِ شام و قلبِ صبح اس کاوش کے شاہد ہیں
نکالی ہے اندھیروں کے لہو سے روشنی ہم نے

سمجھتے ہیں اصولِ زندگی کو زندگی لیکن
تری خاطر بدل ڈالے اصولِ زندگی ہم نے

ہمارے سامنے جب حُسن کی فطرت پہ حرف آیا
تو بڑھ کر چھو نک دی آتش کدوں میں زندگی ہم نے

ہمارے بے ریا سجدے تھے اور تیغوں کی محرابیں
بنایا تھا شعارِ بندگی کو بندگی ہم نے

پھٹے خیموں سے، ٹوٹی کشتیوں سے، ریگزاروں سے
دیئے ہیں زندگی کو آفتابِ زندگی ہم نے

جہاں سائنس محوِ رقص ہے حکمت غزلخواں ہے
جلائے ہیں یہاں پہلے چراغِ آگہی ہم نے

یہ اک مُردوں کی دنیا ہے یہ اک لاشوں کی بستی ہے
کہاں چھیڑا ہے احسان آ کے سازِ زندگی ہم نے

میخانۂ انقلاب

پلا وہ جام ساقی انجمن سرشار ہو جائے
خرد کو نیند آ جائے جنوں بیدار ہو جائے

تنوں میں بیکسوں کے پھونک دے وہ روحِ آزادی
غلامی کا سکوں آمادۂ پیکار ہو جائے

یہ آخر کسل میں ڈوبی ہوئی انگڑائیاں کب تک
جو سانس آئے لہو دیتی ہوئی تلوار ہو جائے

ہے ننگِ مے کشی پی کر بہک جانا بہاروں میں
ضرورت ہے چمن انجام سے ہشیار ہو جائے

طلسمِ بے خودی کے ٹوٹنے کا وقت آ پہنچا
قیامت سے یہ کہہ دو خواب سے بیدار ہو جائے

سفینہ میکدے کا آ گیا گردابِ خونیں میں

جو مے کش ناخدا ہو جائیں بیڑا پار ہو جائے

مغنّی آج اُس آتش نوائی کی ضرورت ہے

کہ ہر تپتی ہوئی لَے برقِ بے زنہار ہو جائے

بہاریں ڈھونڈھتی ہیں پھر وہ پُر آشوب ہنگامے

وہی دار و رسن کا گرم پھر بازار ہو جائے

شہیدوں کی شریعت عام کر دے یکبارگی میں

جو سر کو دار کے قابل کرے سردار ہو جائے

جواں موسم ہے ایسی آتشِ سیّال چھلکا دے

کہ ہر موجِ نفس پیغمبرِ پیکار ہو جائے

اُٹھائے تو کوئی تعمیرِ آزادی کی بنیادیں

مرا ذمّہ نہ ہر مزدور اگر معمار ہو جائے

سرِ میخانہ اُس درسِ بغاوت کی ضرورت ہے

جمودِ بے حسی اک مستقل آزار ہو جائے

زمانے بھر پہ جب روشن ہے قیمت خونِ دہقاں کی

تو پھر طوقِ غلامی کیوں گلے کا ہار ہو جائے

ابھی تو وقت ہے بیدار ہو سکتی ہے خودداری

کہیں ایسا نہ ہو احساس بھی دشوار ہو جائے

مشورۂ حیات

رمِ زندگی کے خوگر یہ تو مرگِ زندگی ہے

نہ یہ کارِ امتیازی، نہ یہ کیفِ امتیازی

ہیں نشیب ہی کے سینوں میں بلندیوں کی راہیں

مری مشکلوں نے دی ہے مجھے خوئے بے نیازی

خدمتِ خلق

خدمتِ خلقِ خدا ہے بندگی در بندگی

ہے یہی انسانیت خلّاقِ انساں کی قسم

اس عبادت سے مجھے ملتا ہے کچھ ایسا سکوں

جیسے پیشانی میں ضم ہو جائے سیمائے حرم

ہو نظر غُرباں تو ہو جاتا ہے انساں بے کنار

ذرّۂ ناچیز سے لیتا ہے کارِ جامِ جم

دل سے سازِ نطق میں ڈھلتے ہیں ایسے زمزمے

رام ہوتے ہیں سپاری، ٹوٹ جاتے ہیں صنم

خوفِ نقضِ امن سے آزادیٔ فکر و عمل

دفن ہو جاتی ہے سینے میں مگر رہتا ہے غم

آدمی شعلہ بھی ہے اور شمعِ کافوری بھی ہے
یعنی اس پروردۂ قدرت کو مجبوری بھی ہے

افلاس

اگرچہ خواب پریشاں ہے غربت و افلاس
بربِّ کعبہ کہ ہے اس کی جانفزا تعبیر
مگر عوام کا حصہ کہاں دلِ آزاد
کہاں نصیب ہر اک کو نگاہِ بے زنجیر
یہ راز سینہ ہے کم ظرف کی نظر سے بلند
کہ مفلسی ہے سراپا بصیرتِ تدبیر

گفتنی

گر وقت تجھے پیش کرے دین و سیاست
جو بات نہ معلوم ہو کر لے اُسے معلوم
اعمال میں اچھّی نہیں تاخیر پسندی
کر خود کو نہ اندیشہ و ادراک سے محروم
مردانِ خردمند ہیں اس راز سے آگاہ
کر دیتا ہے ماحول خیالات کو مسموم

مشعل

ہو رُوح گر سرورِ حضوری سے آشنا

دل کا کوئی مقام مکدّر نہ رہ سکے

خودداریِ حیات کو کر اس قدر بلند،

اس سرزمیں پہ جُوئے غلامی نہ بہ سکے

موجیں جو اپنی اپنی جگہ ہوں نہ بے قرار

اس نازشِ خرام سے دریا نہ بہ سکے

ہر آرزو ہو محکم و جاوید و سربلند

بن جائے جان پر بھی تو منہ سے نہ کہہ سکے

اک لمحہ بھی سزا و جزا سے جدا نہیں

وہ ظلم کر کہ تُو جسے کل خود بھی سہہ سکے

تجربہ

قفس کی تعمیر میں معاون تری نشیمن پسندیاں ہیں
وگرنہ پرواز کے لئے تو بلندیاں ہی بلندیاں ہیں

ہے خدمتِ خلق اوجِ انساں جو بن پڑے تو بلند ہو جا
کہ اک اسی نکتۂ خفی میں تمام تر ارجمندیاں ہیں

تونگروں میں نہیں جہالت مگر نہ جانے یہ بات کیا ہے
اسی طرح خودنمائیاں ہیں اسی طرح خودپسندیاں ہیں

کبھی جو ٹوٹے خمارِ مکتب تو اس طرف بھی نگاہ کرنا
کہ ذرے ذرے کے آئینے میں عجب عجب نقشبندیاں ہیں

بہت ہی دشوار راستہ ہے فضائے کالج سے علم دیں تک
قدم قدم پہ لگے ہیں پھاٹک جگہ جگہ راہ بندیاں ہیں

چراغِ رہگذر

شباب اِک صدفِ زندگی سہی لیکن
مزا تو جب ہے کہ اس کا گُہر ہو تابندہ
حیات پرورشِ جسم کو نہیں کہتے
اس آسماں پہ کہاں مہر و ماہ تابندہ
گراں بہا ہے متاعِ بصیرت و احساس
اسی سے فکر و عمل کا ہے سلسلہ زندہ
وہ نقش چھوڑ زمانے کی تربیت کے لئے
فنا کے بعد نہ ہو جس سے رُوح شرمندہ

محشرِ احساس

حق گوئی سے شکستِ فسوں پا رہا ہوں میں
پرچم کو شیطنت کے نگوں پا رہا ہوں میں

اب ساتھ دے رہا ہے زمانہ شباب کا
اب ہر شبابِ نو کو جنوں پا رہا ہوں میں

فطرت بدل رہی ہے زمانے کے ساتھ ساتھ
ہر شئے میں انقلابِ دروں پا رہا ہوں میں

ہر نوجوان اپنی جگہ ہے شرار و برق
گلیوں کو درس گاہِ جنوں پا رہا ہوں میں

کلیاں شرر فشاں ہیں، نسیمِ سحر سموم
اب پتھروں میں دورہ خوں پا رہا ہوں میں

مٹی کی تشنگی کو ہے درکار خون ابھی،

ذرّوں میں التہابِ جنوں پا رہا ہوں میں

جوشِ عمل کی آگ ہے سینوں میں موجزن

بشروں پہ رنگِ سوزِ دروں پا رہا ہوں میں

شریانِ منصفی میں لہو کی رمق نہیں

کن کن بلندیوں کو نگوں پا رہا ہوں میں

تجدیدِ زر نگار میں فطرت ہے منہمک

ہر سمت اک فضائے زبوں پا رہا ہوں میں

بیٹھا ہوں دل میں ضبط کیئے حشرِ انتظار

آتش نوائیوں میں سکوں پا رہا ہوں میں

عزم و رزم

اگر خدا پہ یقین تمام ہے تجھ کو
تو چاہئے کہ کرے اختیار اس کی صفات

نہیں ہیں رحم کے خوگر مصیبتوں کے ہجوم
دلا سکیں گے مگر عزم و رزم تجھکو نجات

نکال دل سے خیالاتِ ناقص و ناساز
ترے حرم میں یہی لعنتیں ہیں لات منات

قفس کو توڑ قناعت کی زندگی سے گذر!
کہ جد و جہد ہے فی الاصل التزام حیات

نہ مطمئن ہو مراعاتِ حال سے ہرگز
کہ اک نفس سے زیادہ نہیں ہے اس کو ثبات

عجیب چیز ہے ذوقِ جمالِ مستقبل
اسی کی نقش گری ہے حیات ہو کہ ممات

غلاموں کی بغاوت

اگر چونکے ہیں احساسِ خودی سے
تو اب اِن بے لگاموں کو نہ روکو!
غلاموں ہی کی پروردہ ہے شاہی
بغاوت سے غلاموں کو نہ روکو!

اخلاق

تخریب کا پہلو ہو کہ تعمیر کا رُخ ہو
ہر پردۂ ہستی پہ ہے اخلاق کا انجام
کٹتے ہیں زبانوں سے گلے بزمِ جہاں میں
ہیں خنجر و شمشیر و تبر مفت میں بدنام
ناکام ہے افسوں تری شیریں سخنی کا
تلخی کا نہ دے بھول کے دشمن کو بھی الزام

الامان والحذر

نصابِ غرب کی تعلیم نو میں
ضمیروں سے روا ہے بے وفائی
خرد کی گمرہی کا آخری موڑ
دکھاتا ہے مقامِ کبریائی
نہیں ہیں اہلِ دل اربابِ تحقیق
جو کہتے ہیں ریا کو بے ریائی،
فقیہانِ حرم ہیں غرقِ انجام
صحائف کے لبوں پر ہے دُہائی

ہم ایسے علم سے بے علم اچھے
ہو جس میں ادّعائے کبریائی

رودادِ منزل

انسان ضرورت کا پرستار ہے طبعاً

تاریخ میں اوّل سے ہیں ادیان ہی ادیان

جھکتا ہے کبھی انجم و خورشید کے آگے

لاتا ہے کبھی قوت و جبروت پہ ایمان

گہ عقل کے مکتب میں سکھے درسِ جنوں میں

بدلے ہیں عبادت کے غرض سیکڑوں عنوان

آسودہ ابھی تک بھی نہیں ذوقِ تجسّس

بندوں کو نہیں اپنے خداوند کی پہچان

برسوں میں اسی فکر سے بے چین رہا ہوں

تسکین کی صورت کو ترستا تھا یہ ارمان

لیکن مجھے اک مرشدِ[ل] کامل نے بتایا

اس نکتۂ باریک کو حل کرتا ہے قرآن

کانٹا ہو کہ گل باغ کی رعنائی میں گم ہے

ہر ایک صفت ذات کی پہنائی میں گم ہے

اختلافِ خیال

تیری آنکھوں پہ حجاباتِ تعیّش ہیں ابھی

ورنہ یہ ساز، یہ مطرب، یہ ترنّم کیا ہے

تجھ کو دن رات علاجِ غمِ عدنام کا خبط

مجھ کو یہ فکر کہ انجامِ تبسّم کیا ہے

ل قبلہ حافظ الفضل حسین صاحب گھروی کا خواب میں ایک اشارہ۔

انحطاط

حیران ہوں احسانؔ زمانہ کی روش پر
عورت میں حیا، مرد میں تقدیس نہیں ہے

اجسام کی زینت میں ہیں مصروف مشینیں
لیکن کہیں تعلیمِ نوامیس نہیں ہے

اتنا بھی سمجھتے نہیں ظالم کہ یہ چمِ خم
اک شعلۂ مسموم ہے بر جیس نہیں ہے

الحاد کی زد پر ہیں بزرگوں کی روایات
تخریب ہی تخریب ہے تاسیس نہیں ہے

کہہ دے کوئی مایوس فقیہانِ امم سے
ضدی تو ہے انسان مگر ابلیس نہیں ہے

مرکزی نقطہ

ہر مذہب و ملت کا فسوں ٹوٹ رہا ہے
کج راہِ ترقّی سے ہے گمراہ زمانہ

بے نور ہیں ارواح، دلوں میں ہیں اندھیرے
تنویرِ تقدّس ہے ضمیروں سے روانہ

ہر سمت ہے محرومیٔ احساس کا افسوں
تاریک ہیں اطوارِ گراں تا بہ کرانہ

سازوں میں ہیں نرم دیدہ صحائف کے ترانے
محفل میں ہے الحاد کا بے ربط فسانہ

معیار سے آگاہ مفکّر نہ مدبّر
کردار سے گفتار پہ اُترا ہے زمانہ

ہیں دولت و انصاف کی تخلیق جرائم
ملتا ہی نہیں غیرتِ قومی کو ٹھکانا
انسان جس ایمان کے مرکز سے جدا ہے
دشوار ہے دشوار اُدھر لوٹ کے جانا

طلب

اس چیز سے آگاہ کہاں ہر کس و ناکس
بیتاب دل و دیدۂ بیدار مجھے دے!
ایمان مرا قسمتِ ابلیس میں لکھ کر
ابلیس سے چھینا ہوا اقرار مجھے دے

احساسِ مجروح

کیا زمانہ تھا کہ قدرت تھی بشر پر مہرباں
ہر ضرورت کے مطابق پیشوا آتے رہے
اب تمدن پر ہے مدت سے فسونِ رقص و مے
اُس تمدن پر سلاطیں جس سے تھراتے رہے
بک رہا ہے تُل کے کانٹوں میں غریبوں کا لہو
کیا جہاں سے اہلِ دل اہلِ نظر جاتے رہے

عقیدہ

کم نظر آنے لگے جب سے مری چادر کا طول
میرے ارمانوں نے اتنے پاؤں پھیلائے نہیں

روز و شب اک عالمِ سُود و زیاں اور آدمی
میرے دل پر یہ خیالِ خام منڈلائے نہیں

میری نظروں میں اُمیدیں ہیں فقط پرچھائیاں
تیرا یہ ایماں کہ یہ اجسام ہیں سائے نہیں

مَیں سمجھتا ہوں کہ ہر ساعت ہے اِک نیرنگِ نَو
حال میں ماضی کے منظر گھوم کر آئے نہیں

ہے نوشتہ کا یقیں، ناسازیٔ ذوقِ عمل
حوصلے میرے توکّل تک مجھے لائے نہیں

ہر نفس حکمِ خدا ہے ہر قدم جُہدِ حیات
اس سے آگے اور عقدے ہیں نے سلجھائے نہیں
نوجوانوں کے عمل سے ہو نہ بیزار و نفور
کیونکہ یہ تیرے زمانے کیلئے آئے نہیں

دَورِ حاضر

ہوائیں ناموافق چل رہی ہیں
چراغِ دل سنبھالے لے رہا ہے
کسانوں کو ستم پرور تمدّن
ستارے لے کے ذرّے دے رہا ہے

تفریق

غریب دوست ہے سرمایہ دار سے بہتر
تجھے یقین نہیں ہے تو ہوش مند نہیں

خلوص و مہر سے عاری ہے فطرتِ زردار
نظر بلند نہیں، قلب دردمند نہیں!

وہاں حکایتِ اعزاز و فرّ و جاہ و جلال،
مگر نمود و نمائش یہاں پسند نہیں،

حذر کہ اہلِ دول ہیں گزندِ سرتاپا
مگر غریب کی تحقیر میں گزند نہیں!

اُسی سے مانگ جو شاہوں کو بھیک دیتا ہے
وہ در سنا ہے کسی کے لئے بھی بند نہیں!!

اذانِ بُتکدہ

جرم وگناہ

اللہ اللہ مقامِ جرم و گناہ

"ہم جب اس پر نگاہ کرتے ہیں"

جُرم ملتے ہیں فاقہ مستوں میں،

اہلِ دولت گناہ کرتے ہیں!

شکوۂ تقدیر

کیوں نہ کانٹے راہ میں تیری قدم گیری کریں
آرزومندِ بشاشت اور عمل سے انحراف؟

خود بدی کا مرتکب اور تہمتیں ابلیس پر
میری غیرت کو ہے ایسی زندگی سے انحراف!

ٹوٹتے ہیں غافلوں کی نیند پر رہزن ضرور
گردشِ افلاک بُزدل کو نہیں کرتی معاف!

جا رہا ہے مدّتوں سے کارواں پستی کی سمت
نوعِ انسانی میں بڑھتے آ رہے ہیں اختلاف!

مسجدیں بے روح سجدوں کی دکانیں بن گئیں
عشق کے اسرار سے خالی ہیں کعبے کے طواف

روح کے شعلے سے جب ہوتی ہے روشن شمعِ دل
ڈال دیتی ہے نظر انساں کی پتھر میں شگاف!
زنگ کی کھائی ہوئی تیغیں ہیں تیری منتظر
دے رہے ہیں دُور سے آواز مردانِ مصاف
اُٹھ! کہ اب تجدیدِ غیرت چاہتی ہے زندگی
ناؤ ہے طوفاں کے آنگن میں ہوائیں ہیں خلاف
بہرہ ور ہیں لطفِ یزداں سے فقط اہلِ ہمم
شکوۂ تقدیر یکسر خامیوں کا اعتراف

غزل

چُپ کھڑے ہیں درمیانِ کعبہ و بُت خانہ ہم
کس سے کہہ دیں کس طرح کہہ دیں ترا افسانہ ہم

شام سے اس فکر میں ہیں ساقیٔ میخانہ ہم
کیسے دیکھیں گے وداعِ شیشہ و پیمانہ ہم

عشق کی یک جائی و ایمانِ محکم کی قسم
تجھ ہی تک محدود ہیں اے جلوۂ جانانہ ہم

اک مسلسل کشمکش، اک مستقل کرب و گداز
وہ جہاں آگاہ اور کونین سے بیگانہ ہم

نغمہ و ماتم بھی دھوکا شکوہ و شکوہ بھی فریب
کہہ رہے ہیں جانے کیا افسانہ در افسانہ ہم

ہے اسی اک شوق پر بزمِ جہاں کا انعقاد

خود وہ شمعِ انجمن کہلائے اور پروانہ ہم

جب یہ دیکھا اپنے مرکز پر ہے ہر شے برقرار

آ گئے آخر ترے قدموں میں بیتابانہ ہم

آؤ مل کر تصفیہ کر لیں مقدّم کون ہے

حاصلِ مے خانہ تم ہو، رونقِ مے خانہ ہم

رُک چلیں احسانؔ نضیں آ گیا ہنگامِ معت

اب یہیں سے چھیڑتے ہیں دوسرا افسانہ ہم

کس نمی پرسد کہ یارکیستی

تیری نگاہ لے جو زمانے کا جائزہ
آئے گلی گلی میں تماشا یہی نظر
یکسر فسونِ صورت و قامت ہے بے خطا
احساسِ علم و فضل کو ہر گام پر خطر
گنجائشیں ہیں جنسِ غلامی کی ہر طرف
حیران ہیں اپنے نرخ سے مردانِ باہنر
خوددار و ذی شعور بہر رنگ بے وقار
ناقص دل و ضمیر بہر کیف معتبر!
پیمانہ سازِ وقت نہ جانے کدھر گئے
کس سمت داعیانِ حکومت کی ہے نظر

چپ کیوں ہے اس مقام پہ قانون کی زباں؟

کیوں اپنے فرضِ عین سے مذہب ہے بے خبر؟

اخلاق کے اصولِ توازن کو کیا ہوا؟

نشتر یہ کیوں نہیں رگِ فاسد پہ کارگر؟

اِطلاع

کلف دے دے کے نغماتِ جواں کا

فضاؤں میں ارادے بُن رہا ہوں

ہوائے تُند سے گھبرانے والو!

میں طوفانوں کی آہٹ سُن رہا ہُوں

سیاہ کار مقرّر

عصیاں کا جواز اور یہ تقریرِ مسلسل

ہیں دیدہ وروں کو یہ نقابات حریری

چھپتا ہے کہیں اطلس و کمخواب میں شعلہ

کرتی نہیں مستور غلامی کو مشیری

پڑتا نہیں کردار پہ گفتار کا پردہ

بنتی نہیں دشنام کا تریاقِ نفیری

برہان نہ وجدان، نہ منطق نہ سیاست

یہ بول رہی ہے تری تاریک ضمیری

ایک امیر دوست کی گرم مزاجی سے متاثر ہو کر

تو صاحبِ زر تو ہے مگر، دوست
کیوں قرض تو نگری سے ہے عار
رستے میں گدا سے تُرش رُوئی
باچھوں میں ہیں کف، نگاہ خونخوار
یہ جودوسخا سے چشم پوشی
پیسے کے عوض یہ تلخ گفتار
گر اس سے ہے زیرِ بارِ تہذیب
تو بھی تو ہے پشتِ خاک پر بار
دونوں میں نہیں ہے فرق کچھ بھی
تو صاحبِ سیم و زر وہ نادار
کیا جانے وہ اشتہا کی تکلیف
فاقوں سے جسے نہیں سروکار
منعم کو یہ کیا خبر کہ، کیسے
مر جاتے ہیں بے دوا کے بیمار

آنکھوں پہ پڑے ہوئے ہیں پردے
اخلاق کی گر چکی ہے دیوار

اتنی بھی خبر نہیں ہے افسوس
مجبور ہے وہ، نہ تو ہے مختار

ہے دشت و چمن کا ایک صانع
ہے شام و سحر کا ایک معمار

انکار کا حق نہیں ہے تجھ کو
لیکن وہ سوال کا ہے حقدار

خسیس سرمایہ دار

بہ شوقِ دولت جنوں کی حد تک، یہ کسب کے نارواطریقے

تو خود ہی انصاف سے بتا دے یہی قرینہ ہے آدمی کا؟

بھلا یہ فطرت کی بخششوں میں اگر خیانت نہیں تو کیا ہے

کہ رزق لاکھوں کا اور قبضہ تری زیاں کارزندگی کا؟

غرورِ دولت میں زندگی کا نفس نفس محوِ خودکشی ہے

سمجھ نہ دُنیا کو جاودانی یہ ہے تماشا روا روی کا

ایک جاگیردار سے

مجھکو پروا نہیں گر صاحبِ جاگیر ہے تو
میرے اللہ کے قبضے میں ہے اب میری معاش
ہے مری روح کے معبد میں چراغانِ بہشت
تیرے باطن پہ گراں ہے ترے ایمان کی لاش
مجھکو احساس ملا ہے، تجھے افیونِ طرب
میرا دل شعلۂ ذی روح، ترا برف کی قاش
تیری فہرستِ دعا میں ہیں زر و جام و صنم
رازِ جام و صنم و زر مری تحقیق میں فاش
مَیں ہوں تقسیمِ تمدن کی شکایت کا مریض
اسی کانٹے کی کلیجے سے زباں تک ہے خراش

میرے آگے کوئی سلطانِ زمن ہو کہ فقیر
مجھ کو رہتی ہے فقط جوہرِ ذاتی کی تلاش

یقینِ مستقبل

حادثاتِ دہر سے مایوس ہو میری بلا
یاس و حرماں سے جھجکنا مرد کی فطرت نہیں
حال، ماضی کی بنا پر خواہ کچھ دے یا نہ دے
آچکا ہے مجھ کو مستقبل کے وعدوں کا یقیں

میزان

اندور میں اک شاعرِ مہجور و حزیں کی
سوہانِ جگر تھی الم انگیز گُفتار
تکلیف پہ تکلیف، مصیبت پہ مصیبت
صدمات پہ صدمات تھے ادبار پہ ادبار
ہر رات کے ہونٹوں پہ تباہی کے فسانے
ہر صبح کے ماتھے پہ رُخِ شام کے آثار
احسان جسے نیند میسّر ہو سکوں سے
مقروض سے ہر حال میں اچھّا ہے وہ بیمار

عورت

گو رُوح میں شوخی ہے مگر روزِ ازل سے
آئی ہے یہ تقدیر میں لے کر دلِ غمناک

یہ دولتِ غم گرچہ علامت ہے وفا کی
چالاک زمانہ اسے کہہ دیتا ہے چالاک

کرتی ہے یہ اُلفت میں وہ معصوم غلامی
آزادی ہے سیلاب میں جس کے خس و خاشاک

سودائے محبّت ہو کہ سرمایۂ غفارت
احساس کی شدّت میں یہ کھو دیتی ہے ادراک

یہ خوگرِ تسلیم و رضا بھی ہے یہاں تک
شوہر سے عزیز اس کو نہیں کچھ تہِ افلاک

کھنچنے میں یہ تلوار، لپٹنے میں یہ سنبل
وہ دن نہ خدا لائے کہ ہو جائے یہ بیباک
جس اوج پہ اِس صنف کی کھلتی ہے حقیقت
اُس اوج سے آگاہ نہیں دیدۂ ادراک
فردوس و جہنّم میں یہ دیوار کھڑی ہے
اک سمت سے تاریک ہے اک سمت سے ضوناک
اے دوست خبردار کہ تحویل میں اس کی
تنظیم کے باوصف امانت ہے خطرناک

مسرّت

مفلس کو اذیّت ہی اذیّت ہے جہاں میں
اربابِ طرب آنکھ اُٹھانے نہیں دیتے
افلاس کی تقدیر کے محتاط فرشتے
اس لفظ کو تحریر میں آنے نہیں دیتے

امیر منزل[1]

درست ہے کہ یہ تعمیر ہے بلند و حسیں
مگر حقیقتِ تعمیر سے تو کر آگاہ

یہ آئینے ہیں یتیموں کے دل کی روداد یں
یہ سُرخ رنگ ہے بیواؤں کے لہو کا گواہ

یہ ریخ ریخ میں ناطق شگافِ دل موجود
یہ ذرّے ذرّے میں مسکین عورتوں کی نگاہ

یہ نیم خواب سا زینہ کہ جیسے قبرِ شقی
دبے ہوئے یہ خموشی میں کرب و نالہ و آہ

---

[1] گڑھی پختہ ضلع مظفر نگر میں کہی گئی۔ اس سے متعلق ایک طویل افسانہ ہے اگر ضرورت کا تقاضا ہوا تو شاید میری کتاب "خودساز" میں آ جائے

یہ ضبطِ صوت سے آگاہ دمِ بخود کر دے
جہاں نہ گونج سکے لا الٰہ الا اللہ
ہے ذرّہ ذرّہ گواہی تری شقاوت کی
تری جبیں پہ شہادت سی دے رہے ہیں گناہ
گندھا ہے کتنے غریبوں کا خون گارے میں
اس اک محل کے لئے کتنے گھر ہوئے ہیں تباہ
ضمیر و رُوح کے عیبوں کی پردہ داری کو
رہا ہے کتنے ریاکار افسروں سے نباہ
دلوں کے کتنے چراغوں پہ ہاتھ مارا ہے
کیا ہے کتنے سہاگوں کی روشنی کو سیاہ
چلا دئے ہیں مقابر پہ کتنے ہل تُو نے
کیا ہے کتنی مساجد کی زینتوں کو تباہ

شریک اس میں کہاں تک ہے دولتِ اوقات
کیا ہے کتنے ثوابوں میں ارتکابِ گناہ
ترے ضمیر کے مرحوم ولولوں کی قسم
ترا مکان تو وہ ہے جہاں نہ مہر نہ ماہ
ابھی ہے وقت دعا مانگ ہو لحد روشن
اگرچہ نامۂ اعمال ہو چکا ہے سیاہ

اعترافِ گناہ

ڈوبتی آواز، گھبرائے ہوئے الفاظ میں
جب کوئی شرما کے کرتا ہے گنہ کا اعتراف
دے نہیں سکتے جواب اُس کا زمانے کے علوم
نطق پر پڑتا ہے سرتا سر خموشی کا غلاف

سرمایہ دار کی موت (ایک مشاہدہ)

دولت نے ضعیفی میں بھی عصیاں سے نہ روکا
ڈھارس ہی بندھاتے رہے ناپاک نوالے

اب نزع کا عالم ہے کئی دن سے مگر کون
اُکھڑی ہوئی سانسوں کے تسلسل کو سنبھالے

یہ کام نہ طاقت کا نہ دولت کا کہ اس وقت
تعمیرِ تن و توش کو گرنے سے بچالے

یہ حال ہے رہ رہ کے جو کُھل جاتی ہیں آنکھیں
کرتا ہے گڑھا مال اشاروں سے حوالے

جیسے کسی مفلس کے ٹپکتے ہوئے گھر میں
مٹّی کا دیا رات کو لیتا ہو سنبھالے

سرفراز آرٹسٹ کے نام

جو شخص ترے وقت کی قیمت کو نہ جانے
زنہار نہیں ہے وہ ترا مونس و غم خوار
مانا کہ خوشی میں ہے ترے ساتھ زمانہ
غم میں نہیں ہوتا کوئی غم خوار کا غم خوار
پرکھے نہ اگر تیری کسوٹی ہی کسی کو
یہ تیری خطا ہے کہ زمانہ ہے گنہگار؟
اے کاش تجھے وقت کا یہ وصف ہو معلوم
تخریب کا مزدور ہے، تعمیر کا معمار

افرادِ خصوصی

محروم ہیں ادراک سے اس دیس کے باسی
کہتے ہیں نہنگوں کو جو نیّا کے کھِوَیّا
اسرار سے آگاہ نہ ہندو نہ مسلمان
منبر کا یہ طوطی ہے وہ مندر کا گویّا
شحنہ ہوں کہ تجّار، مقنّن ہوں کہ لیڈر
ہم طرز و ہم انداز ہے ان سب کا رویّہ
تھمتی نہیں ان کے دل و ایمان کی چرخی
کتا نہیں ان کے نظرّیات کا پہیّا

صورت اور سیرت میں تفریق

پیمانۂ سیرت نہیں اندازِ خد و خال
دل ہے مرا مایوس پریشاں ہیں نگاہیں

اس خاک کے پتلوں میں نہیں جوہرِ کردار
اللہ کسے پیار کریں کس کو نہ چاہیں

نزدیک سے احساس کی آنکھوں نے جو دیکھا
کتّوں کے سروں پر بھی نظر آئیں کلاہیں

تقدیس کے چہرے ہیں گناہوں کے بدن پر
جبریل کے غول میں ہیں شیطان کی باہیں

ایسے بھی گزرتے ہیں مجالس میں شب و روز
نغمات سے آنسو ہیں رواں ساز سے آہیں

قاتلینوں پہ قابض ہے درندوں کی جماعت
ملتی ہیں جرائم کو عدالت میں پناہیں
اس سے بھی نہیں جراَتِ انکار کسی کو
کانٹوں سے گذرتی ہیں چمن زار کی راہیں
آتے ہیں لبِ عشق پہ الفاظ یہ اکثر
دامانِ وفا ہاتھ سے چھوڑیں نہ نباہیں

دیہاتی سے

دیئے جا سُود خوروں کو کمائی
یونہی دل کا لہو پانی کئے جا!
پلائے جا یونہی سانپوں کو اَمرت
یُونہی کھیتوں کی نگرانی کئے جا!

خوفناک مستقبل

دشوار ہے امروز سے اندازۂ فردا
کھنچ کھنچ کے ہر اک تارِ نظر ٹوٹ رہا ہے

تہذیب ہے مفلوج، مذاہب ہیں نگوں سار
ماتھے سے تمدن کے لہو پھوٹ رہا ہے

پابندِ صحائف نہیں گمراہ عقائد
صدیوں کی روایات کا دم ٹوٹ رہا ہے

تقلید زدہ ہند کو افسوس گرِ تہذیب
دے دے کے مناصب کی جھلک لوٹ رہا ہے

لیکن وہ مناظر بھی نظر آتے ہیں جن میں
ہر گام پہ رہ رہ کے فلک ٹوٹ رہا ہے

ایک سیاسی اور زندان پسند دوست سے

سادہ دل ہمگی آیشی کیوں اُن سے عقیدت ہے تجھے
جن کے اغراض و مقاصد ہیں اساسِ اختلاف
یہ دکھاتے ہیں تجھے بھی لیڈری کے شعبدے
جن کے سجدوں میں شرارت، جن کے جھوٹے عہدکاف
میں بھی بھٹکا تھا کبھی اپنے مقامِ فکر سے
عقل میری بھی رہی ہے کچھ دنوں دل کے خلاف
میرے کام آئی مگر اک مردِ مومن کی نظر
آئینے میں پھر نظر آنے لگا منہ صاف صاف
یہ تمدّن کے عدو غارت گرِ تہذیب و دیں
خون پی لیتے ہیں دے دے کر کلیجوں میں شگاف

یاد رکھ اہلِ نظر منہ میں زباں رکھتے نہیں
آستانِ فکر سے کوسوں ہے شہرت کا طواف!
قوم کے لیڈر، پرانی خانقاہوں کے فقیر
دیکھنے میں آئے ہیں اکثر صداقت کے خلاف
تو رسولوں کی طرح معصوم سمجھا ہے جنہیں
اُن کو مذہب سے تنفّر ہے خدا سے انحراف!

خوشامد

ہے زبانوں کے فسوں کا رُوح پرور مدار
گر زمیں ہو شور پودا پھولتا پھلتا نہیں
اس میں کیا شک ہے خوشامد بھی ہے کار آمد مگر
یہ وہ سکّہ ہے جو ہر بازار میں چلتا نہیں

اشارات

آزاد فتحپوری کے نام

حسن اب آئینے پہ ناز کرے
عشق میں آجکل ہے خودداری

اپنی تسکین کے ہیں سب جویا
کون کرتا ہے کس کی غمخواری

تیرے امکان سے جو باہر ہے
اس قیافے سے کر نہ جی بھاری

علم کیا، دین کیا، سیاست کیا
سب ہیں ہندوستاں میں سرکاری

شہرت میں ہنروروں کے لئے
زندگی ہے کمال دشواری

جسم مسجد میں، روح دفتر میں
یہ نہ کچھ کافری نہ دینداری

کارزارِ حیات میں اے دوست
خواب سے خوب تر ہے بیداری

پرچمِ فتح لے کے چلتی ہے
زود پروازی و جگرداری

مکتوبِ مختصر

(مجتبیٰ احمد خاں کے نام)

ادب و شعر کے باوصف بھی جینے کے لئے
سب کیا حدِّ شرافت سے گذرنے کے سوا

دوست بیدرد ہیں، اربابِ طرب بے احساس
کوئی چارہ نہیں اس دیس میں مرنے کے سوا

آغوش

دیہات میں فاقوں کی ستائی ہوئی مائیں
تقدیر کا جن کی کہیں دانہ ہے نہ پانی

آغوش میں وہ لختِ جگر پال رہی ہیں
کہلائے گی سیلابِ بلا جن کی جوانی

اصلاحِ تمدّن ہے اسی قوم کا حصّہ
دن جس کے سلونے ہیں نہ راتیں ہیں سہانی

دولت کے نتیجے ہی پہ ہوتے ہیں درخشاں
افلاس میں اولاد کی کثرت کے معانی

سنگین و فلک بوس محلّات میں اکثر
آتے ہیں نظر مجھ کو وہ آثارِ نہانی

ہیں جن کے خط و خال تو پُر نور و درخشاں
لیکن ہے پسِ پشت الم ناک کہانی

گہواروں میں جنبش ہیں کم بیش وہ اجسام
بن جائیں گے جو قوم کے معدے کی گرانی

گودوں میں کنیزوں کی وہ بچّے ہیں کہ جن کے
ملتی نہیں چہروں پہ نجابت کی نشانی

گردش میں ہیں ذرّات سے خورشید و قمر تک
تغئیر ہے تقدیرِ زمانی و مکانی

مذہب اور سیاست

اللہ ان افرادِ سیاست سے بچائے
سمجھیں نہ منافع کو، نہ نقصان کو جانیں
اغراض پہ ہے خامہ و تقریر کی بنیاد
یہ وید کے قائل ہیں نہ قرآن کو مانیں
اس پینٹھ میں سوداگرِ مذہب بھی ہزاروں
کھولے ہوئے بیٹھے ہیں عقاید کی دکانیں

روشنی کا سایہ

اے دوست ترا حسنِ خلق، ترا جوہرِ ذاتی
رکھتا ہے تجھے حلقۂ احباب میں برتر
ہونٹوں سے نہیں بلکہ دلوں سے ہیں ثنا خواں
ہم طرّہ، وہم بازی، وہم ساغر، وہم زر
لیکن یہ تعلّق، یہ تعیّش، یہ تشکّر،
اک ریت کی تعمیر ہے، اک برف کی چادر
دیکھا ہے نگاہوں نے کئی بار یہ عالم
آلام میں اپنوں کے بدل جاتے ہیں تیور
جو مائدہ و بادہ سے وابستہ ہیں وہ لوگ
ظاہر میں خوش اخلاق ہیں باطن میں فروتر

توفیقِ خدا دے تو یہ کوشش ہے ترا فرض
جو پست ہیں تجھ سے اُنہیں لے آتے برابر
اوّل سے غریبوں کی ڈراشت میں وفا ہے
حصّے میں امیروں کے خودی ہے نہ خدا ہے

انجامِ فکر

جبیں تر ہے ندامت کے عرق سے
تکلّم میں خموشی گھُل رہی ہے
زمانے کی حقیقت کیا بتاؤں
یہاں اپنی حقیقت کھُل رہی ہے

نوابؔ[۱] صدیق علیخاں سے

صدیق علی پوچھ نہ اس وقت مرا حال
آنسو نہیں دیتے مجھے الفاظ کی مہلت

اک چیز ہے تو دیدۂ حق بیں کی نظر میں
اس دور میں ہے تجھ سا مسلمان غنیمت

ہے تیری نگاہوں میں فغاں کار خموشی
دل میں ہے ترے شعلہ فشاں طورِ محبت

بے پردہ ہیں اسرارِ سیاست ترے دل پر
بخشی ہے تجھے خالقِ اکبر نے بصیرت

۱۔ نواب صدیق علی خاں ایم۔ ایل۔ اے۔ ناگپور (سی۔ پی)

یہ دَور مگر تجھکو اُبھرنے نہیں دے گا

اِس دَور میں ہے تاجرِ ملّت کی ضرورت

بازار میں اب پوچھ نہیں جنسِ وفا کی

اجسام کے بیوپار میں مقصود ہے دولت

بے خونِ غریباں نہیں اُٹھتی کوئی دیوار

بے زحمتِ مزدور نہیں کوئی عمارت

ہوتی نہیں بے مکر سرافراز زمانہ

سجّادہ نشینی ہو کہ مسجد کی امامت

تو سادہ مسلماں، تجھے معلوم نہیں ہے

کِس رنگ میں بیواؤں کی ہوتی ہے تجارت

کِس بھاؤ لیا جاتا ہے خونِ رگِ مزدور

کِس نرخ پہ بکتی ہے مساکین کی عصمت

اب پھولتے پھلتے ہیں وہ اربابِ ہنرمند
ہیں جن کے حسد اچند غلامانِ حکومت

توقیر حسین خاں لکھنوی سے

میں شاعرِ مزدور ہوں لیڈر تو نہیں ہوں
کھانا مجھے درکار ہے باسی ہو کہ تازہ
کب سے تجھے گھبرایا ہوا دیکھ رہا ہوں
احسان کی دعوت ہے کہ سامانِ جنازہ

ایک خیال

کبھی کبھی مجھے یہ بھی خیال آتا ہے
گناہ و جرم جو ہو جائے دہر سے نابُود
عدالتوں کے وہ حکّام پھر کہاں جائیں
نظر سے جن کی ہیں اوجھل صداقتوں کے حدود
جو پَل رہے ہیں جرائم کی خوشہ چینی سے
جو انبساط و مروّت کو جانتے ہیں جمود
جو کھا رہے ہیں فریب و دروغ کا صدقہ
سمجھتے ہیں جو محبّت کو جذبۂ بے سُود

پرتوِ احساس

ہوائے دہر سے چڑھتا ہے جب احساس کا دریا
جنون و عقل دونوں کا سفینہ ڈگمگاتا ہے
غم و عشرت خس و خاشاک کی مانند بہتے ہیں
بصیرت جاگتی ہے فلسفہ نظریں جھکاتا ہے
نگاہیں بے تکلّف دوڑتی ہیں سنگ و آہن میں
جوانی کے حسیں خوابوں کا افسوں ٹوٹ جاتا ہے
کوئی ہنستا ہے جب ناآشنائے قیمتِ ہستی
مجھے انسان کی مجبوریوں پر رحم آتا ہے

ایک اصل

امروز سے بے فکر ، شب و روز سے غافل
شاید کہ جہاں میں تجھے جینا نہیں منظور
تقلیدِ معیشت کے جنوں نے تجھے کھویا
آنکھوں سے ہے معذور ورنہ ادراک سے مجبور
جینا بھی ہنر ، مرد کا مرنا بھی ہنر ہے
نکتہ ہے یہ جرمن سے نہ جاپان سے مستور
دنیا کو جگانے کی جو کوشش نہیں کرتا
سو جاتا ہے خود بھی یہ زمانہ کا ہے دستور
کرتا نہیں جو غور الم گاہِ جہاں پر
تریاقِ الم اُس کی نظر سے ہے بہت دور

شواہد

دَورِ حاضر کے تمدّن کی روش کیا کہئے
پارہ پارہ ہے یہاں فکر و نظر کی تنظیم
رُوح آلُودہ ہے، دل کور، نگاہیں ناپاک
کرُچکا ساحرِ تہذیبِ نوی کارِ عظیم
اہلِ دولت پہ ہے باران خطاب و انعام
اور فاقے ہیں غریبوں میں برابر تقسیم
ساز و ساغر ہیں تونگر کے شبستانوں میں
جسمِ مزدُور زمستاں میں ہے محتاجِ گلیم
ہر دو جانب نہ تفکّر، نہ تدبّر، نہ خیال
ہر دو جانب کوئی صوفی نہ مفکّر نہ حکیم

کاش ہر خواجہ و مزدور پہ یہ راز ہو فاش
انقلابات کے ضامن ہیں یہ حالاتِ سقیم

مفلسوں کی دولت

رفتہ رفتہ کھل رہے ہیں مجھ پہ اسرارِ حیات
ہر قدم پر عالمِ حیرت ہے اور کچھ بھی نہیں

اہلِ زر میں علم و فرصت کی فزونی ہے مگر
خواب کی سی عارضی راحت ہے اور کچھ بھی نہیں

مفلسوں میں حادثاتِ روز و شب کے ساتھ ساتھ
تابناک ایمان کی دولت ہے اور کچھ بھی نہیں

مولانا ظفر علیخاں

کبھی جو "لارنس گارڈن" میں ظفر علیخاں کو دیکھتا ہوں
کمالِ علم و ادب کے ہوتے خمولِ انساں کو دیکھتا ہوں
سیاستِ خام نے ادب سے عجیب انسان لے کے کھویا
گدازِ دل ہیر کارواں کو فریبِ منزل کا دے کے کھویا
نہ اب نظر میں ہجومِ عرفاں، نہ فکر میں اعتدال باقی
متاعِ ہستی میں رہ گیا ہے فسانۂ قیل و قال باقی
سیاست و اجتماعیت میں ہے بے دماغوں کی اکثریت
مگر قصورِ ادب کے طاقوں میں ہے چراغوں کی اکثریت
سیاست اک معرکہ ہے جس سے عوام مدت سے بے خبر ہیں
جماعتوں میں شقاوتوں کی حدیں نظر سے وسیع تر ہیں

جو منفرد ہے کبھی جماعت کی سمت بھی گامزن نہ ہوگا
کہ ریگزاروں میں جا گرے گا تو گل عزیز چمن نہ ہوگا

فلسفہ

چرخ پر زرّیں ستارے، باغ میں خوش رنگ پھول
آئینہ خانہ ہے دنیا، آدمی حیران ہے
فلسفہ جس کو بتاتے ہیں خرد کے مدّعی
نامکمّل جستجو کا دل نشیں عنوان ہے

حدیثِ آگہی

نوجوانوں کے دلوں میں زندگی بیدار ہے
شورشِ تخریب کھاتی ہے لہو میں پیچ و تاب

ان عزائم کی نہیں لیکن بصیرت پر نمود
پھر کہیں تعبیر کے رستے میں آ جائے نہ خواب

ہو چکی ہیں بے بصر تقلید سے روحیں کثیف
مر چکے خفتی ارادے، دے چکے بازو جواب،

رشتۂ قول و عمل ٹوٹے ہوئے مدّت ہوئی
ڈوبنے کو ہے سنبھالا لے کے ان کا آفتاب

ان کی آزادی میں ہے قانونِ آزادی بھی جرم
ان کو ہے اخلاق سے نفرت خدا سے اجتناب،

کاش ان نوخیز دیوانوں کو سمجھا دے کوئی
دین سے منکر سیاست کا نتیجہ ہے خراب
مذہبی قانون رکھتا ہے وہ اسلوبِ عمل
لے کے پیغامِ سکوں آتا ہے دورِ انقلاب

سوالیہ

سنتے آئے ہیں کہ انساں اشرف المخلوق ہے
اور دُنیا کا خدا خالق ہے یہ باطل نہیں!
اب سوال اتنا سا باقی ہے کہ آخر کس لیے
آدمی کو لذّتِ دنیا کا حق حاصل نہیں؟

تاج محل

توقیر طاہر گنگوہی کے ہمراہ

مری طویل خموشی سے بدگمان نہ ہو!
ہے لاجواب زمانے میں تاج کی تعمیر
کمالِ فن ہے کہ مرمر کی بے مسام سلیں
لئے ہوئے ہیں چراغانِ طور کی تنویر
فضائیں بول رہی ہیں کہ سنگ سازوں نے
زمیں پہ کھینچ کے رکھ دی ہے عرش کی تصویر
مگر نہ جانے تجھے بھی دکھائی دیتی ہے
جلی حروف میں، دیوار و بام کی تحریر

شکوہ و جاہ سے اے فرّ قیصری ہشیار
ہے بے کسی ترے خواب جمیل کی تعبیر
جو رقص و نغمہ و صورت گری پہ مائل ہے
ہے جس کا حسنِ سماعت رباب و چنگ و نفیر
نقوشِ قصر و چمن کو جو زندگی سمجھے
بہ زعمِ خویش کمر سے جو کھول دے شمشیر
بہت قریب زمانِ زوال ہے اس کا
خیال و خواب سے باہر مآل ہے اس کا

تذبذب

بجا بجا کہ اگر علم ہو تمام و درست
رہے نہ دہر میں ناقص عدالتوں کا وجود
مگر سوال تو یہ ہے کہ اس زمانے میں
وسیع تر ہیں جہاں تیرہ روزیوں کے حدود
جہاں ضمیر کی تاریکیوں نے کر ڈالے
ہمہ مقام بصیرت کے راستے مسدود
زمانِ علم و عمل ممکنات سے ہے بھی؟
یہ انقلاب اصولِ حیات سے ہے بھی؟؟

فقیر اور بادشاہ

تکیے میں عجب شان سے اک نیم کے نیچے
ہنس بول کے مسرور ہیں آپس ہیں درآویز

کس درجہ ہیں صاف ان کے ضمیر، ان کی نگاہیں
مستی کی حدوں پر بھی ہے گفتار شکر ریز

پابندِ مساوات و اخوّت ہے یہ طبقہ
جس چیز سے تقسیم و حکومت کو ہے پرہیز

کر لیتے ہیں تکیے میں گزر مِل کے قلندر
یہ جرم ہے خاشاکِ حکومت میں شرر ریز

اچھے ہیں گدا اُن اُمراء و وزراء سے
جینے سے جو معذور ہیں بے منّتِ انگریز

اعلانِ وقت

ہیں تجربات و علوم اک امانتِ اقوام
سمجھ سکیں گے نہ لیکن فرنگیوں کے غلام

جو اہلِ علم ہیں ذوقِ عمل سے بیگانہ
وہ خاک دینگے زمانے کو امن کا پیغام

دلوں میں اُن کے خیانت، نظر میں عیّاری
نگاہ و دل سے ہے اوجھل مجاہدوں کا مقام

یہ آج وقت کا اعلان ہے کہ دنیا میں
عمل بغیر کوئی دن میں زندگی ہے حرام

نفس کو آگ کے سانچے میں ڈھالنا ہوگا
جو بیٹھ کر کے بیٹھ گئے ہو جگا لنا ہوگا

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات

مزنگ (لاہور) میں صفوں والے چوک سے گزرتے ہوئے (جہاں مسجد سے بہت قریب ایک شراب خانہ ہے) محمد اسحاق خاں نشوؔ سے ایک طویل گفتگو کے باقیات

بجا کہ پاس ہی مسجد کے بک رہی ہے شراب
یہ نادرست کے ہاں وصف ناگوار نہیں!
نسیمِ غرب کے جھونکوں میں جینے والوں کو
ہوائے مذہب و تہذیب سازگار نہیں
نہ خُلق ہے، نہ مروّت، نہ آشتی، نہ لحاظ
علوم جُیب ہیں، سیاست کا اعتبار نہیں
قدم قدم پہ ہیں آباد معصیّت خانے
کمر میں علم کی شمشیر آبدار نہیں

کوئی ہوس کا کوئی ہے خِرد کا دیوانہ
نظر کسی کی توازن پہ زینہار نہیں!

فروغ پر ہے عدالت میں عدل کا نیلام
مگر یہ جرم حکومت کو ناگوار نہیں

مزدور کا مقام

مجھے جب غور پر مجبور کر دیتی ہے تنہائی
کھلی آنکھوں ضمیرِ آبِ گِل میں ڈوب جاتا ہوں
نظر آتے ہیں جو انسانیت کے بام و در مجھ کو
بلند ان سب میں اک مزدور کی ہستی کو پاتا ہوں

ایک مشاہدے کا تاثّر

اس طرح کچہری میں نظر آتی ہے دنیا
جس طرح سمندر میں تموج ہو کہ جزر و مد
احساس سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ہل چل
قانون کی پوجا ہے کہ توروز جرائم

ترغیب

افواج پر غرور حریفوں کو ہے مگر
مومن کو نازِ خالقِ اکبر کی ذات پر

سر رشتۂ غرض کی اسیری سے دُور باش
ہر وقت ہے خدا کی نظر کائنات پر

ذوقِ وفا میں دار و رسن کو سمجھ عزیز
تاریخ کی بنا ہے انہیں حادثات پر

دیوانہ وار تیغ و تبر سے اُلجھ کے دیکھ
زعمِ حیات رشک کرے گا وفات پر

ہندوستانی لیڈر کا خط

یہ ہند، یہ بدبخت بہائم کا خرابہ
بے وجہ نہیں بیکس و بے قیمت و پامال

اس خطۂ بے غیرت و بے شرم کا لیڈر
خط اک نئے شاگرد کو کرتا ہے یہ ارسال

ہوتے ہیں بلند اتنے ہی لیڈر کے مدارج
افراد ہوں جس درجہ پریشان و زبوں حال

جو ذوقِ بلندی میں ہو پرواز پہ مائل
اس طائرِ بیتاب کے کُندے سے بھی کتر ڈال

دنیا میں بری چیز ہے تفریق کی تبلیغ
کر اُنس و مساوات کی تعمیر کو پامال

چندے کی وصولی میں مہارت ہے ضروری

لے اہلِ زمانہ سے برتا وا ان مہ وسال

اکسیر ہیں اکسیر اسیری کے فضائل!

تابع ہیں اس افسونِ مقدّس کے زر و مال

اعمال کی اصلاح بدل دیتی ہے تقدیر

تقدیر میں لازم نہیں بہبود کے اقوال

جو تیرے شب و روزِ مسرّت میں مخل ہو

بے خوف اُس آئینِ تمدن کو کچل ڈال

احسان ہوں جس ملک میں اس طرح کے لیڈر

اُس ملک میں کس طرح نہ اقوام ہوں بدحال

نااہل حکّام

جن کو نامرغوب ہے اخلاق و راہِ مستقیم
ٹوٹتے ہیں جن کے ہاتھوں سیکڑوں معصوم دل
جو کسانوں کے لہو سے کھینچ لیتے ہیں شراب
جن کے پرتو سے ہے روحِ آدمیّت مضمحل
کرسیٔ انصاف پر ان نابکاروں کا وجود
ہے رعایا پر حکومت کا عذابِ مستقل

اسرار

دو راستے (۲)

اشکوں میں بھی ارواح کے چلتے ہیں سفینے
مل جاتا ہے اس طرح بھی طوفان میں ساحل
لیکن دلِ بیدار کی وادی سے عموماً
ہو جاتے ہیں نزدیک خوش آثار منازل
اس راہ میں ہیں دشت تو اُس راہ میں قلزم
نہ شیون کوئی بیکار، نہ آنسو کوئی باطل

غزل

غرورِ آدمیت ناسزائے آدمیّت ہے
کہ خوبی نقص کی ظلمت میں پہچانی نہیں جاتی

جبینِ حال جھک سکتی نہیں ماضی کے قدموں پر
تنزّل کی طرف تخمیر انسانی نہیں جاتی

تصادم وقت کی آواز سے اچھا نہیں ہوتا
کہ یہ لغزیدہ گامی معتبر مانی نہیں جاتی

نقوشِ زندگی جس میں نہ ہر صورت سے بول اٹھّیں
وہ تصویر اصل میں تصویر گردانی نہیں جاتی

متاعِ زندگی کی قدر و قیمت کو وہ کیا جانے
بہائے وقت جس غافل سے پہچانی نہیں جاتی

مؤذن اور مجذوب

(مجذوب کو مسجد سے نکال دینے پر)

مجذوب کی جانب نہ حقارت سے نظر کر
مسجد کے گدھے تیری عبادت ہے عوامی
تقوے ہے ترا احشام، یقیں ہے ترا نا کام
طاعت میں تری نقص ہے عرفان میں خامی
ہے یہ تری پستی کہ تو نازاں ہے دعا پر
اس کی یہ بلندی کہ ہے سجدہ بھی غلامی
مائل بہ دعا ہوتا ہے انسان اسی وقت
جب روح کی نیکی میں نظر آتی ہے خامی

قیمتِ غم

صیقل گرِ ہستی ہیں زمانے کے حوادث
ہرگز نہ ہو آلام کی کثرت سے ہراساں

ہوتی ہے سحر رات کے پہلو سے ہویدا
ویرانۂ ظلمات میں ہے چشمۂ حیواں

نقصان کی لے بھی ہے پسِ پردۂ ماتم
اشکوں میں تبسم کی تجلی بھی ہے غلطاں

دردِ دلِ سوزاں کو اکارت نہ سمجھ لے
ہوتا ہے بلندی پہ پہنچ کر یہ درخشاں

فکر

گفتگو سے سکوت بہتر ہے
فکر سے دور تر ہے شور و خروش
اہلِ دستور طاقتوں کے حضور
فکر ہے اک عبادتِ خاموش
جس کی ہر التجا فسونِ تاثیر
جس کا ہر لمحہ مدعا بدوش

مطالعہ کا انجام

منطق و فلسفہ و دین و تصوف کی کتب
یہ تو سچ ہے کہ ہیں تعمیر و ترقی کی کفیل
لیکن احساں یہ تحقیق و تجسس کے نقوش
میری نظروں میں ہیں مجبوریٔ انساں کی دلیل

سفلگی کی خصوصیات

سفلہ فطرت سفید پوش اکثر
سیدھے سادوں پہ فقرے کستے ہیں

دوستی کو یہ جانتے ہیں گناہ
اور محبت سے دور بستے ہیں

ہیں پرستارِ عشرتِ امروز
پھر بھی تسکین کو ترستے ہیں

گرچہ ارزاں ہیں یہ بھی سستی ہیں
ان کے ایمان ان سے سستے ہیں

بندگانِ وفا ہیں سب خاموش
وہ گرجتے نہیں برستے ہیں

احساسِ تغیّر

کیا خاک سکوں ہو دلِ محزوں کو میسّر
پروانۂ نقطہ پہ ہے تخئیل کی روانی

ہر سانس پہ کونین کے اطوار جدا ہیں
آج اور ہیں کل اور خط و خالِ زمانی

تشکیلِ عناصر ہی پہ موقوف نہیں ہے
ماحول بدل دیتا ہے لفظوں کے معانی

ہر رنگ کی تقدیر پہ طاری ہے تغیّر
عمورنگہِ امکاں میں ہر اک نقش ہے فانی

عجز

جب خیال آتا ہے میں ہوں جسم یا رُوحِ لطیف
اور جواب اس کا کسی جانب سے کچھ پاتا نہیں
آنکھ میں آنسو نہیں رُکتے اُلجھ جاتی ہے سانس
ڈھونڈتا ہوں اور مقام اپنا نظر آتا نہیں

غزل

ہر نفس بے سوز ہے ہر آہ بے تاثیر ہے

یا الٰہی کیا یہ محرومی مری تقدیر ہے

بے محابا جب کسی صورت پہ اٹھتی ہے نظر

دل یہ کہتا ہے کہیں دیکھی ہوئی تصویر ہے

ایک افسانے کے دو عنوان ہیں مرگ و حیات

ایک ان میں خواب ہے اک خواب کی تعبیر ہے

اپنی رعنائی سے بڑھ کر رکھ میرے دل کا خیال

قدرداں جس کو میسّر ہو وہی تصویر ہے

عمر کے بڑھتے تقاضوں پر نہ چل دیوانہ وار

بیٹھتی دیوار ہے، گرتی ہوئی تعمیر ہے

کاندھلہ کو چھوڑ کر احسان یہ عقدہ کھلا

شہر ایمانوں کے گورستان کی تعمیر ہے!

انتقام

طیش کھا کر سرحدِ ادراک سے آگے نہ بڑھ؟

درہم و برہم نہ کر تسکین و راحت کا نظام

کھولنے لگتا ہے خود اپنے لہو میں آدمی

دل میں جب بیدار ہو جاتا ہے جوشِ انتقام

لے - کاندھلہ - میرا وطن　　　احسان دانش

ملک پور[۱]

اللہ رے ملک پور کے یہ سادہ گھروندے
ہر سال جنہیں جھیل کے لے جاتی ہے برسات
دیکھے مری آنکھوں سے کوئی اُن کی تجلّی
بے جلوہ و تاریک ہیں شاہوں کے محلّات
محبوب نظر ہیں مجھے یہ سادہ گھروندے
ایوانِ فلک بوس گناہوں کے مقامات

۱۔ میرے وطن قصبہ کاندھلہ سے غالباً تین میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے

دولتِ افلاس

بیشک نہیں رہتا ہے تونگر کو خدا یاد
افلاس بھی کمبخت ہے پیغمبرِ الحاد
کہتے ہیں جسے زیست وہ شے اور ہی کچھ ہے
اس چیز کو سمجھا ہے نہ پرویز نہ فرہاد
جس راہ پہ بستے ہوں اِدھر نادر اُدھر نور
ملتی ہے مسافر کو وہاں غیب سے امداد
دولت[۱] ہو کہ افلاس[۲] ہم انجام ہیں دونوں
دونوں سے اکھڑ جاتی ہے ایمان کی بنیاد

---

[۱] "انما اولادکم واموالکم فتنۃ" قرآن کریم

[۲] "کاد الفقر ان یکون کفراً" حدیث نبی کریم علیہ السلام

موت کی عظمت

ہاں بجا بالکل بجا انعامِ قدرت ہے حیات
بے گماں دلکش ہے یہ صورت سرائے زندگی
موت کے اُس قصر کی زینت کا اندازہ تو کر!
جس کے دروازے پہ ہیں ہنگامہ ہائے زندگی

بلندی و پستی

یہ خار و گل کا تفاوت نظر کا دھوکا ہے
سیا ہے دونوں کا خیاطِ گلستاں نے لباس
ہزار اوج پہ تیرا دماغ ہو لیکن
بلند تیری نظر سے ہے باغباں کا قیاس
تری نظر کی رسائی نہیں حقیقت تک
ہے کشمکش سے زمانے کی تو شکارِ ہراس
ترا مقام تو تیرا مقام ہے اے دوست
اس امتیاز کی رکھی نہ انبیاء نے اساس
یکے ست دودِ کثیف و یکے ست نورِ لطیف
زمانہ ساز کجا و کجا زمانہ شناس

احساسِ مجبوری

ماورائے عقلِ انسانی ہے عالم کا نظام
کاہ سے تا کہکشاں ہر خشک و تر مجبور ہے

یہ کسی صورت بھی پا سکتا نہیں رازِ حیات
جب بہ ہر پرواز ادراکِ بشر مجبور ہے

اپنے محور سے نہیں ہٹتے ستاروں کے قدم
اک روش پر گردشِ شام و سحر مجبور ہے

رحم کے قابل ہے اپنی بے بسی میں آدمی
اس پہ آزادی کی تہمت ہے مگر مجبور ہے

جس بلندی پر حقیقت کے مظاہر ہیں وہاں
عقل ناکارہ ہے، پرکارِ نظر مجبور ہے

غزل

عشق کے ہمراہ دولت کی بسر ہوتی نہیں
آہ، لیکن اس نتیجے پر نظر ہوتی نہیں

گردشِ انجم الٹ دیتی ہے جب دل کی بساط
کوئی شام آسئے بآسانی سحر ہوتی نہیں

دوستی اور وضع داری میں ہے وہ نازک سا فرق
دل کی دنیا لٹتی رہتی ہے خبر ہوتی نہیں

ہوں اگرچہ زخم وسیلے ناسُور اجسام خودی
زندگی پر نامرادی کارگر ہوتی نہیں

کامرانی کا یقیں ہے کامرانی کی اساس
کوئی منزل دُور یا دشوار تر ہوتی نہیں

ترکِ دنیا ایک معیاری عبادت ہے مگر

یہ مہم وہ ہے بآسانی جو سر ہوتی نہیں

مطمئن مردوں کو کر سکتے نہیں چنگ و رباب

گلشنوں میں شاہبازوں کی بسر ہوتی نہیں

حسن میں خوئے وفا دولت میں تسکینِ تمام

آدمی محسوس کرتا ہے مگر ہوتی نہیں

ضبطِ غم سے جس میں ہو جاتی ہیں آہیں بھی شریک

وہ اَنی تلوار ہوتی ہے نظر ہوتی نہیں

عورت اور قسمت سے یوں تبدیل ہوتی ہے حیات

آدمی تو کیا فرشتوں کو خبر ہوتی نہیں

ظلمتِ عصیاں میں روشن کر ندامت کے چراغ

ان سیہ راتوں کے دامن میں سحر ہوتی نہیں

مشاہدہ

مرحلوں پر مرحلے ہیں حادثوں پر حادثے
سوچ کر رکھ شاہراہِ زندگانی میں قدم
بے تکلّف تجربے کے ساتھ ہو لیتا ہے علم
علم کے ہمراہ لیکن تجربہ دیکھا ہے کم

بے خبری

نگاہ و علم کی روشن خرام گاہوں میں
طرح طرح کے مناظر ہیں زندگی کے لئے
لباس و جسم کی آرائشیں معاذ اللہ
چراغِ رُوح ترستا ہے روشنی کے لئے
رموزِ دھر سے آگاہ مولوی نہ فقیہہ
کہ ہے بصیرت و عرفاں کسی کسی کے لئے
اس انکشاف کے قابل ابھی نہیں یہ جہاں
"مفید موت ہے یا زیست آدمی کے لئے"

فکرِ پریشاں

تعیّش کی اچھّی نہیں آبیاری
سرابی ہے رعنائیٔ حُسنِ صورت

یقیں سے ہے روشن اگر تیرا ایماں
گماں سے ہے بڑھ کر عمل میں سہولت

چلا چل یُونہی روندتا راہِ غم کو
وراثت میں غم چھوڑتا ہے مسرّت

خوشی میں نہ آمیز کر غم کے آنسو
مصیبت سے بڑھ کر ہے خوفِ مصیبت

مسلسل اُمیدوں میں ہے زندگانی
نہ دے دل کو مایوسیوں کی اجازت

تغیّر

یہ قطعہ اُن تاثرات کے آغاز میں ہوا تھا جن کی تخلیق میری نظم

"عشقؔ اور مجبوری کے دوراہے پر ایک حادثہ ہے"

انسان ہے اور جلوۂ نیرنگِ تغیّر
کل اور تھا آج اور مرے شعر کا مفہوم
مجبور جب انسان کو کر دے کوئی ماحول
اس وقت خدا جانے وہ مجرم ہے کہ معصوم

لہ یہ نظم میری کتاب "چراغاں" میں صفحہ ۹۴ پر شائع ہوئی ہے

احسان دانش

پیش‌بندی

کسی کو بھی نہیں انکار اس سے
محبّت کی بُری ہوتی ہے افتاد
اُچٹتے سے تبسّم کا نتیجہ
بشاشت کی ہلا دیتا ہے بُنیاد
تبسّم سے کہو آنسو نہ روکے
نہ ہونے پائے لذّت غم کی برباد

غزل

پوجئے بُت ساز کو یا بُت کو سجدہ کیجئے
دل میں پہلے جرأت انکار پیدا کیجئے

غم میں لذت، درد میں راحت، نہیں بچوں کا کھیل
آنسوؤں میں دل کے ٹکڑوں کا اضافہ کیجئے

کرکے آغازِ وفا بے سُود ہے فکرِ مآل
اب تو ہر تلخی کو ہنس ہنس کر گوارا کیجئے

بار ہے اک بار، یہ ہمواریٔ رفتارِ زیست
ختم اب یک رنگیٔ امروز و فردا کیجئے

ماہ کا جلوہ، ستاروں کی چمک، پھولوں کے رنگ
سب میں تیرا حسن ہے کس کس کو سجدہ کیجئے

اس دور ہی پر بھی رُک جاتی ہے اکثر زندگی

ترکِ عقبیٰ کیجئے، یا ترکِ دنیا کیجئے

کارواں کو اہتمامِ خواب ہے تنگِ سفر

شام ہی سے انتظارِ صبحِ فردا کیجئے

رُوح کا پندار ٹوٹے، سر سے پہلے دل جُھکے

سجدہ کرنا ہے تو پھر اس طرح سجدہ کیجئے

زندگی ہر موڑ پر مجھ کو یہ دیتی ہے صدا

فکرِ فردا چھوڑیئے، تعمیرِ فردا کیجئے

چاہتا ہے دل کہ یہ منزل بھی ہو جائے عبور

آئیے پردے سے باہر، حشر برپا کیجئے

دل رہے شائستہ، نظریں بے ادب ہونے نہ پائیں

اس طرح سے اب انہیں احساں دکھایا کیجئے

قدردانی و قدرافزائی

مختلف دو مقام ہیں اے دوست　　قدردانی و قدرافزائی

قدردانی ہے ربطِ قلب و نظر　　ربطِ قلب و نظر میں پہنائی

قدرافزائی ہے خیالِ نمود　　جس میں پائندگی نہ گیرائی

لیکن اس فرق پر نظر رکھنا

"کارِ صد احتیاط و دانائی"

آثارِ حیات

حُبِّ وطن سے گر تجھے حاصل نہیں گداز
جھوٹے ہیں سب وفا و محبت کے سوز و ساز

احساس ہر مقام پہ احساس ہی تو ہے
شبنم سے منحرف نہ وہ شعلوں سے بے نیاز

تجھ کو ترا مقام نہیں ہے ابھی نصیب
پست و بلند کا ہے ابھی تجھ کو امتیاز

کب تک غنودگی میں رہے گا شبابِ نَو
اب آچکا ہے زغنۂ گرداب میں جہاز

احساسِ قرب ہو کہ غمِ دوریِ مقام
جہدِ حیات سے ہے محبت کا ساز باز

یہ شرط ہے کہ اپنے مقاصد نہ بھول جائیں

تو حُسنِ بے پناہ ، تو میں عشق بے نیاز

مصوّر اور طبیب

اک فلسفیٔ خطّۂ یونان نے احسان

کیا بات کہی زندہ و پائندہ و قائم

"رہتا ہے مصوّر کا ہر اک نقش اُجاگر

چھپ جاتے ہیں مٹّی میں اطبا کے جرائم"

مقیاس

اگر آزاد رہنا ہو جہاں میں
مبارک ہے ہوس کی ناتمامی
ضرورت کو نہ بڑھنے دے حدوں سے
ضرورت کے مطابق ہے غلامی!

عیارِ غیرت

بجا ہے ہاں بجا ہے وہ بھی غیرت ہے بڑی غیرت
جو کشتِ دولت و ثروت کی پیداوار ہوتی ہے
مگر جب پستیوں کی سمت پھر جاتا ہے رُخ اُس کا
بلندی پر اُسے اک سانس بھی دشوار ہوتی ہے
ضمیر و دل اہمیّت نہیں رکھتے نگاہوں میں
نجابت خود فروشی کے لئے تیّار ہوتی ہے
مگر ہوتا نہیں زنہار امکانِ شکست اُس میں
جو غیرت عالمِ افلاس میں بیدار ہوتی ہے

عزیز اظہار الحسنؒ سے

کہتے ہیں جس کو علم، عمل کی ہے کسنی!
کاش آئے راس تجھ کو مرا نسخۂ حیات
بچپن میں کر نہ لے تراکردارِ خودکشی
محدود علم تک ہی نہ رہ جائے کائنات
دار العمل میں ہوتا ہے صیقل علوم پر
صیقل نہ ہو تو علم کے جوہر ہیں بے ثبات

سلہ مولوی اظہار الحسن کاندھلوی

پَرن [1]

بھیڑ رہگیروں کی ہے تالاب کے چاروں طرف
ایک ہی عقدہ کو سلجھانے میں کوشاں ہیں خیال
طالب و مطلوب نے کر لی ہے شب کو خودکشی
توبہ توبہ دو وفاداروں کی خلوت کا مآل
رُو بہ گردُوں مرد کا لاشہ ہے عورت منہ کے بل
کیسا مستحکم ہے فطرت کا نظامِ بے زوال
پاسبانی کر رہا ہے عصمتِ نسواں کی وقت
انتہا ہے موت نے رکھا ہے پردے کو بحال

[1] لکھنؤ میں ایک تالاب پر طالب و مطلوب کی خودکشی سے اُنکی لاشوں کے منظر کا احساس اس نظم کا محرک ہے کہ مرد کا لاشہ پانی میں سیدھا تیر رہا تھا اور عورت کا منہ کے بل۔ (رشید)

خاک کے ذرے بھی تقدیروں سے مستثنےٰ نہیں
ساعتوں کی فرد میں ہیں حشر تک کے ماہ و سال

دلاسا

دیکھکر میداں کے ماتھے پر غبارِ لالہ رنگ
سنسنا کر رہ گئی ہے کیوں تری بزمِ دماغ
کیا خبر ہے یہ وہی آندھی ہو جس کی پھونک سے
خون سے بھیگے اندھیروں میں جل اٹھتے ہیں چراغ

مرگِ تہوّر[1]

شوؔر! کیوں مرگِ تہوّر سے ہے اتنا مضمحل
جب سمجھتا ہے کہ راہِ پُر خطر ہے زندگی

موت پر افسوس ہے توہینِ فطرت میں شمار
مصلحت بینی سے مصروفِ سفر ہے زندگی

وقت سے پہلے ہی مستقبل کو دیتی ہے صدا
کتنی گستاخ و شریر و بے بصر ہے زندگی

نالہ و شیون بجز احساسِ مجبوری نہیں
ہے وہی عالم وہی شام و سحر ہے زندگی

تیری غفلت سے طوافِ آب و گل کرتی رہے
ورنہ آزادِ قیودِ بحر و بر ہے زندگی

[1] محمد اسحاق خاں شوؔر کا برادرِ خورد جس نے نوجوانی میں داعیِ اجل کو لبیک کہا

راز پا جائے تو بابِ مرگ پر سجدے کرے
زندگی کی عظمتوں سے بے خبر ہے زندگی

شامِ مرقد سے بہت نزدیک ہے صبحِ ابد
اس سے پہلے زندگی سے دُور تر ہے زندگی

اس کی پروازیں فرشتوں کے نصیبوں میں کہاں
آب و گل سے ماورا، چیزے دگر ہے زندگی

یہ ترا عزمِ تبسّم نا روا ہے یا روا
جب سراسر صورتِ رقصِ شرر ہے زندگی

ہوشیار اے زندگی پر مٹنے والے ہوشیار
اک جھلک ہے بزمِ عالم، اک نظر ہے زندگی

ه اختیار

حقائق

ترا مشرب اجازت تجھ کو دیتا ہے تو دے لیکن
بتا کس منہ سے کہوں اللہ کو تخلیقِ انسانی

مگر یہ پوچھتا ہوں گر خدا تخلیقِ انساں ہے
تو کیا پھر اشرف المخلوق کر سکتا ہے نادانی

اگر یہ فطرۃً آزاد ہے جہل و جرائم میں
تو پھر خالی ترا کشکولِ دل، اور میری پیشانی

وجود و ذات سے ظالم یہ اپنی نظّارہ منکر ہے
کہ آئینہ کئے دیتی ہے ہر ذرّے کی تابانی

ابھی سائنس مٹّی چھانتی پھرتی ہے گلیوں میں
ابھی پنہاں ہے چشمِ فلسفہ سے بابِ عرفانی

دلائل کے چراغ اس راہ میں جلنے نہیں پاتے
مجھے تو میری ناداری نے بخشا نورِ ایمانی

بہت ممنون ہوں میں حادثاتِ زندگانی کا
کہ ہر آنسو چمک کر بن گیا قندیلِ رُوحانی

ہے پہلی شرط ذوقِ بندگی قربِ الٰہی میں
اُٹھاتی ہے محقّق کی نظر دیوارِ حیرانی!

ربوبیّت کو کیا سمجھیں گے وہ جن بدنہادوں میں
خدا کا نام ہے اک آلۂ اغراضِ انسانی

مرے مشرب میں یہ دنیا خدا کا اک تخیّل ہے
یہ کیفیّاتِ روحانی، یہ تعمیراتِ جسمانی

بصیرت و بصارت

ادراک سے ہوتی ہیں انجام کی تعبیریں
تفریحِ نظر تک ہے ماحول کی رعنائی

ہے نیری بلندی سے انجام اگر پنہاں
احساسِ بلندی ہے بے رشتۂ دانائی

اسرار بصیرت کے بالا ہیں بصارت سے
یہ آنکھ کی بینائی وہ قلب کی بینائی

دانش گاہ

ایک دانش گہ مزدور بنانے کے لئے
ہے مرے نقطۂ تخیل پہ ارماں کا طواف

جس میں تدریس کا اک جزو سیاست بھی رہے
جس کی تلقین میں اک شعبۂ لازم ہو مصاف

ہے مگر دید سے اس نکتۂ مخفی پہ نظر
ہو نہ تحریک یہ اغراض حکومت کے خلاف

قابلِ عفو بھی ہے یہ مری گستاخیٔ دل
کیا یہ قانون کے خالق مجھے کردینگے معاف

بلندیاں

عملی یکسوئی

حوادث سے اُلجھ کر مسکرانا میری فطرت ہے
مجھے دشواریوں پر اشک برسانا نہیں آتا
نظر جس کی جمی رہتی ہے مستقبل کے چہرے پر
اُسے ماضی کی سفّاکی کو دہرانا نہیں آتا

معمول

میری کمسن مفلسی نے ٹھوکریں کھائیں مگر
مسکراہٹ کو بھی اب آنسو پلا دیتا ہوں میں
اپنی گنجائش جو پاتا ہوں نگاہِ دوست میں
خلوتِ دل کا ہر اک پردہ اٹھا دیتا ہوں میں
اختیاطاً بھوک نے شاید سزا دی تھی مجھے
انتقاماً بھوک کو اکثر سزا دیتا ہوں میں

ایک ہمعصر شاعر سے

ہے میری نگاہوں میں وہی شعر مکمّل
جو شعلہ ہی شعلہ ہو، تلاطم ہی تلاطم
الفاظ میں ارواح کی فریاد کے جھونکے
مفہوم میں احساس کا ذی رُوح تبسّم
اِس یو۔پی و پنجاب کی تفریق سے بالا
اِک عصرِ خود آگاہ کے افراد ہیں ہم تم
طوفان کے بعد آئے گا اک ایسا زمانہ
قطرات میں بولیں گے خود امراضِ تلاطم
کاغذ پہ جب آجاتے ہیں شاعر کے خیالات
اصنامِ خیالات ہی کرتے ہیں تکلّم

بے پردہ نظر آتی ہے شہرت کی طوائف
الفاظ سے چھن جاتی ہے پیشوازِ ترنّم
نغمات کے افسوں سے جو اُڑتے ہیں فلک پر
تنقید کے معمل میں نظر آئیں گے گم سُم

میری فطرت

میرے اُستادِ شریعت نے بتایا ہے مجھے
صرف تیشہ ہی نہیں ہے آدمی آری بھی ہے
دوستوں میں نرم دل ہوں، دشمنوں میں سخت گیر
میری فطرت میں لچک کے ساتھ خودداری بھی ہے

تعریفی خطوط

راستی کی راہ سے مجھ کو ہٹانے کے لئے
شعبدے کیا کیا مری شہرت دکھاتی ہے مجھے

اس میں کیا شک ہے کہ مجھ کو پستیاں ہیں ناپسند
ماہ و انجم کی بلندی گدگداتی ہے مجھے

"بابِ من آنم کہ من دانم" پہ دے کر دستکیں
سخت حیراں ہوں کہاں دُنیا بلاتی ہے مجھے

بزمِ عالم کیا ہُنر مندوں سے خالی ہو گئی
جن کی نایابی صفِ اوّل میں لاتی ہے مجھے

رُوح جلتی ہے دھوئیں میں سانس لیتا ہے دماغ
جب کوئی پیچھے کی صف آگے بڑھاتی ہے مجھے

ماضیِ مرحوم سے کیا کام ہے جب زندگی
مژدۂ تنویرِ مستقبل سُناتی ہے مجھے
کچھ مرے ہمعصر ہیں کاغذ کی کشتی میں سوار
جن کی غمِ انجام کاوش خوں رلاتی ہے مجھے
یہ طمع کی نمائش، کھوکھلی شہرت کے ڈھونگ
یہ سیاہی نور کا رستہ دکھاتی ہے مجھے
توبہ توبہ میرے خوش فہموں کے تعریفی خطوط
گاہے جی جلتا ہے، گاہے شرم آتی ہے مجھے

فقیری کے متعلق ایک خیال

ایک خوش وضع فقیر کو دیکھ کر

کام ہوتا نہیں مرضی کے مطابق جو کوئی
دل میں ہل چل سی مچا دیتے ہیں اندوہ و ملال
آ کے رک جاتے ہیں بھر آئے گلے میں آنسو
سانس لینا بھی نظر آتا ہے اک کارِ محال
وہ اذیت سی اذیت کہ الٰہی توبہ
نہ تمنا نہ تفکر، نہ ارادے، نہ خیال
ترک کرتے ہیں جو دنیا کو خدا کے بندے
تج کے دولت کو جو رکھتے ہیں فقیری کو بحال!

کرتے ہوں گے جو وہ ناکام فقیری پہ نظر
دیکھتے ہوں گے جو کم ظرف اُمّیدوں کا مآل
دل کی دُنیا پہ قیامت سی گزرتی ہو گی
ٹوٹتے ہوں گے بُری طرح سے اصنامِ خیال
مگر احسان فقیری و گدائی میں ہے فرق
ایک مٹی کا دیا، ایک ہے قندیلِ جلال
ایک احساس کی دولت سے سراسر محروم
ایک کی رُوح تو کیا جسم سراپا اعمال
فقر مشکل ہے، حقیقت میں شہی آساں ہے
پیرہن شبیر کا پہنے ہوئے پھرتے ہیں شغال
فقر کہتے ہیں جسے اہلِ نظر کے نزدیک
اُس کے پندارِ مقدس کا پگھلنا ہے محال

اس کی تقدیر ہے اذکارِ الٰہی کا سرور
اُس کے مشرب میں ہنک ہے کوئی طاقِ سوال

اشارہ

بہ فیضِ درس مجالس، بہ علم نطق و کتاب
حقیقتوں کی رمق ان مکاشفوں میں نہیں
یقین و مشق کے محتاج ہی سہی لیکن
تصورات کا عالم مشاہدوں میں نہیں
سنی سنائی دلیلیں، ڈھلے ڈھلائے اصول
نگاہ و دل کی شہادت مباحثوں میں نہیں

گردش

بُرے دن جب بجھا دیتے ہیں تدبیروں کی قندیلیں
ہر افسانہ مصیبت ماجرا معلوم ہوتا ہے

مصائب میں پناہیں ڈھونڈتی پھرتی ہیں امیدیں
زمانے کا زمانہ بے وفا معلوم ہوتا ہے

سنورتے ہی نہیں ماحول کے بگڑے ہوئے تیور
مقدّر در پئے آزار سا معلوم ہوتا ہے

عزیز و اقربا تک ہی نہیں رہتی ہے مایوسی
جسے دیکھو وہی بدلا ہوا معلوم ہوتا ہے

بہک جاتے ہیں ایماں نیّتیں گمراہ رہتی ہیں
فلک اک موڑ پر ٹھہرا ہوا معلوم ہوتا ہے

برستا ہے نزانوں کا لہو مطرب کی تانوں سے

جہانِ آب وگلِ ماتم سرا معلوم ہوتا ہے

مقدّر کی سیاہی پھیل جاتی ہے نگاہوں میں

دھوئیں سے بند ہر اک راستا معلوم ہوتا ہے

بحمد اللہ میں تشکیک کی دلدل سے باہر ہوں

مجھے تو ہر نفس اک اقتضا معلوم ہوتا ہے

مرے افلاس میں وہ وقت آیا ہے نہ آئے گا

خدا جب اک فریبِ ناخدا معلوم ہوتا ہے

ترکی بہ ترکی

اُن کی خدمت میں جو یہ کہہ کر گئے تھے کہ کبھی مجھ سے بھی تو تمہیں کام پڑے گا !!!

کیا گرے گا میرے شانوں سے مرا بارِ حیات
شاعرِ مزدور ہوں مضبوط دل رکھتا ہوں میں
میری خودداری مسلّم، میرے منصوبے اٹل
رُوح کی خاطر بدن کو مضمحل رکھتا ہوں میں
قرض کے دھبّے سے اب تک پاک ہے دامن مرا
اپنے پیکر میں نرالے آب و گِل رکھتا ہوں میں
زیست کی سلوٹ ہے ہر دشواریٔ راہِ عمل
فطرتِ بیتاب و عزمِ مستقل رکھتا ہوں میں

حیاتِ شعر

اِس دیس میں ہونے کو تو شاعر ہیں ہزاروں
اکثر ہیں مگر فلسفۂ شعر سے محروم
اشعار سہی خاصیّتِ شعر ہے ناپید
افکار سہی، جدّتِ افکار ہے معدوم
ہیں تیرہ و تاریک بیاضیں کی بیاضیں
الفاظ مگر حُسنِ معانی سے ہیں محروم
محدود سا اک دائرۂ فکر و نظر ہے
عرفانِ عناصر کے ضوابط نہیں معلوم
یہ دَور نہیں اپنی حقیقت سے خبردار
اس بادۂ زرفام کی تاثیر ہے مسموم!

تاریخ کے دامن میں بقا پا نہیں سکتا
جینے کا طریقہ نہ ہو جس شعر کا مفہوم

ماضی کی یاد

کل کی تو بات ہے کہ بہ ہر رنگ و ہر طرح
مجھ سا نہ تھا حقیر کوئی کائنات میں
احساس مفلسی نے جگایا وہ رُوح کو
دَوڑی ہوئی ہے برقِ تجلّی حیات میں

اشارۂ ادب

پروردۂ یورپ ہے ترا فکرِ گراں بال
ہر زندہ حقیقت پہ بجا ہے تری تنقید

اخلاق ہی جب تیری نظر میں ہے حماقت
تابندہ حقائق کی روا ہے تجھے تردید

کاوش تری ناکام ہے تکمیل کے باوصف
زنہار یہ سرسام نہیں لائقِ تقلید!

یہ راہبری لے کے تجھے ڈوب نہ جائے
مخدوش ہے یہ علم خطاکار کی تائید

بیدار ہوا کرتی ہے اُس وقت بصیرت
جب اپنے نقائص پہ اُتر آتی ہے تنقید!

حدیثِ یک نظر

ہے کاشتکاروں کا اک ہم سفر پروفیسر
نگاہِ شاعرِ مزدور بن گئی کمپاس

اُدھر ہے فطرت و انساں میں اک خوش آمیزی
اِدھر ہے دامنِ دل میں غرور کی بُو باس

اُدھر ہیں فیضِ جہالت سے خوشنما چہرے
اِدھر ہے علم کی برکت سے رُخ پہ رنگِ ہراس

اُدھر خدا پہ بھروسا، زباں پہ شکرِ خدا
اِدھر دماغ میں برسوں رٹی ہوئی بکواس

اُدھر مآل سے بے فکر زندگی کا جنوں
نفس نفس میں ادھر نوکِ نشترِ احساس

یہ بزدلانہ خموشی ہے زندگی سے بعید
یہ علم خام ہے شیرازہ بندِ فکر و قیاس
مری نظر میں تو وقعت ہے ان کسانوں کی
زمینِ جہل پہ ہے جن کے قہقہوں کی اساس

سرِ راہ ایک موت

صبح اک اونچے محل کے سامنے فٹ پاتھ پر
وہ سماں دیکھا کہ خون آنکھوں میں بھر کر رہ گیا
مخملی گدّوں پہ کتنے رات بھر سوتے رہے
اور اک مزدور پہ ولیسی ٹھٹھر کر مر گیا

دسترخوانی گفتگو

محمد اسحاق خاں شورؔ سے

تو مصوّر بھی ہے، شاعر بھی ہے، اور خطّاط بھی
ایک رُخ تیرا حیات افزا ہے اک مسموم سے
ہے عمل کے واسطے افیون ہر فنِّ لطیف
نشۂ لازم سراپا لغزشِ ملزوم ہے
مرد گر چاہے تو ہے یہ آلۂ اصلاحِ قوم
مجھ کو اس کا ہر اثر، ہر خاصیت معلوم ہے
اک سعادت ہے اگر تو اس سے لے کارِ جہاد
ورنہ یہ تیغِ دو دم ہے اور زیرِ حلقوم ہے

مجھکو کیا تکتا ہے میں وہ شاعرِ مزدور ہوں
بندگی میری مرے اشعار کا مفہوم ہے

غمگینی

لے کے راتوں کو لرزتے ہوئے اشکوں کے چراغ
غم اُترتا ہے تصوّر کے عزا خانوں پر
کتنی ناساز تمنّاؤں کے بادل ہوں گے
جنگ کے خون سے لتھڑے ہوئے میدانوں پر

جوابی گفتگو

محمد رفیق قریشی کاندھلوی سے

ہے مرے ادب کی زینت مرے فکر کی دیانت
نہ رئیس کا مصاحب نہ میں شاہ کا سلامی

مری زندگی حقیقت مری شاعری تعارف
مرا ہم نشین انور[1] مرا ہم جلیس شامی[2]

میں کہاں تھا اس کے قابل جو عطا ہوا ہے مجھ کو
مجھے راس آگئی ہے مری زندگی کی خامی

مرے عشق کو مبارک یہ خطر پسند فطرت
مجھے لے کے بڑھ رہی ہے مرے غم کی ناتمامی

---

1. انور قریشی ایم اے
2. محمد اکرام شامی بی اے

نہ سہی اگر نہیں تھی مری ابتدا کی قیمت
مگر آج ہے غنیمت مرا لطفِ خوش کلامی
مرے سامنے نہیں تھا کوئی پرشکوہ آقا
مری مفلسی نے کی ہے مرے وقت کی غلامی

گمشدگی

نہ جانے خاک چھانیں گے ابھی کن کن منازل کی
نہ جانے آجتک کن کن منازل سے گذر آئے
بقیہِ زندگی کیفِ مسرّت ڈھونڈنے والے
غنیمت ہے اگر خوابِ مسرّت بھی نظر آئے

ادب برائے ادب

یا

ادب برائے زندگی

ہوں مبارک شادکامانِ طرب کو زمزمے
مجھ سے یہ نا ساز و نازک شاعری ہوتی نہیں
یہ تو سب عصیاں کے دفتر ہیں جرائم کے گدام،
جن کی تعمیرِ تعیّش دائمی ہوتی نہیں
ہیں مرے پیشِ نظر وہ عقدہ ہائے مرگ و زیست
ہر کس و ناکس کو جن سے آگہی ہوتی نہیں

دیکھتا ہے کون مزدوروں پہ راتوں کے ستم
ٹمٹماتے ہیں دیئے اور روشنی ہوتی نہیں
کون لیتا ہے کسانوں کے گھروندوں کی خبر
چاند کے باوصف جن میں چاندنی ہوتی نہیں
اشک تو ممکن ہیں فرطِ شادمانی میں مگر
دل تڑپتا ہے تو ہونٹوں پر ہنسی ہوتی نہیں،
نور کے تڑکے سپاہی کو جگانے کے لئے
رزم گاہوں میں بگل ہیں بانسری ہوتی نہیں
مَیں تو کیا دُنیا سمجھتی ہے، زمانہ ہے گواہ
لوریوں کے زیر و بم میں زندگی ہوتی نہیں

احساسِ ناتمام

مَیں خدا کے آسرے پر، زورِ بازو کے طفیل
دشمنوں میں رہ کے مقبولِ زمانہ ہو چکا
دیدۂ انجام بیں سے مانگ کر بارانِ اشک
عمر کے دامن سے گمنامی کا دھبّا دھو چکا
نطق آمادہ نہیں ہے گو شکایت کے لئے
دردِ ناچاری مجھے بیدار پا کر سو چکا
پھر بھی ہے مجھکو کسی بھولی ہوئی شے کی تلاش
جس کو مَیں ماضی کی دھندلی وسعتوں میں کھو چکا

حیاتِ پارہ

مایوسِ وفا ہوں، مرا دل ٹوٹ چکا ہے
اچھا ہوں میں ناشاد و جگر چاک و طپیدہ

ہر شخص میں آثارِ وفا ڈھونڈتے رہنا
بے فکر جوانی کا ہے ناپختہ عقیدہ

مجھکو بھی کبھی تھا یہ جنوں جس کی سزا میں
ہوں خاک میں غلطاں صفتِ اشکِ چکیدہ

واپس نہ ہوئی غم سے تبسم کی بحالی
لوٹا نہیں چہرے پہ مرا رنگِ پریدہ

اب غنچہ و گل پر بھی نگاہیں نہیں اٹھتیں
ہر چند گلستاں کا گلستاں ہے کبیدہ

کہتی ہے یہ افلاس کی بے عیب شریعت
جائز نہیں شاہی کی گدائی میں قصیدہ

صد شکر کہ احسان مری خستہ دلی نے
بخشے ہیں جنوں کو مرے اوصافِ حمیدہ

امّید

کیا عجب ہے اب صداقت پر ہو بنیادِ ادب
ہر طرف تحقیق کا ہنگامہ و ہیجان ہے
جس کو ہم تاریخ کہتے ہیں بہ ایمائے رسوم
یہ تو اک مرحوم افسانوں کا قبرستان ہے

جوابِ مکتوب

مجتبیٰ احمد خاں کو ایک خط

کیا گرائیں گے مجھے میری بلندی سے حریف
جن کا حصّہ بدنصیبی سے خود آگاہی نہیں،
شاعری جن کی گدائی ہے، ادب جن کا فقیر
سوز و تہذیب و حمیّت جن کی ہمراہی نہیں
شاعری کے خوان پر ہے جن کی روزی کا مدار
عشق و مذہب جن کا بے پروانۂ شاہی نہیں
ہے مری تخمیر میں سوزِ عمل جہدِ حیات
اور مرا ایمانِ محکم ہے یہ گمراہی نہیں

جس عروجِ نارواتک ہیں رسا یہ بے ضمیر
میری خودداری کو اُن زینوں سے آگاہی نہیں
ہے فقط اللہ پر میرے عزائم کی نظر
میری ناداری رہینِ منّتِ شاہی نہیں

جبر

کون ہے جو پا سکے تخلیقِ انسانی کا راز
یہ خدائی قوّتیں کیوں کر منظّم ہو گئیں
کس نے پھونکا ہے یہ مٹّی میں فسونِ رنگ و بُو
اس قدر پرچھائیاں کیسے مجسّم ہو گئیں

فنونِ لطیفہ

میرے خیال سے رہتے ہیں زندہ و شاداب
ہوائے دولت و تعلیم میں فنونِ لطیف
اور اِن فنونِ لطیفہ سے نَو بہ نَو لذّات
مگر یہ نشّۂ لذّت حقیقتوں کا حریف
یہی سبب ہے کہ اہلِ جمال میں اکثر
بہار ریز ہیں چہرے، مگر ضمیر کثیف،
یہی سبب ہے کہ اربابِ رقص و نغمہ میں
ہر اک کی رُوحِ عمل ہے بہت علیل و نحیف
یہی سبب ہے کہ ہر نوجوان کے نزدیک
نہ جنسیات ہو جس میں وہ خشک ہے تصنیف

جو آج شعر و ادب میں ہے جدّتِ افکار

یہی ہے روحِ مذاہب کو باعثِ تکلیف

مآلِ نَو سے گراں تا گراں ہیں بیگانہ

تیرہ روزہ، یہ تہذیبِ مغربی کے حلیف

انہیں خبر ہی نہیں ہے کہ گردشِ افلاک

نہ جانے کتنے فسانے کر چکی تالیف

زمانہ روز نقشا ہیں اُلٹتا رہتا ہے

بدلتی رہتی ہے اشیائے دھر کی تعریف

جو لمحہ آتا ہے مدہوشِ حال آتا ہے

زوال، صورتِ دَورِ کمال آتا ہے

گرم گفتاری

ایک مغرور گریجویٹ سے

کیا ضروری ہے کہ عالم بھی ہو اِک کرم کتاب
شاخِ گل پر دہ کے کانٹا پھول ہو سکتا نہیں
ہے بہت جغرافیہ دانی و سیّاحی میں فرق
کب پڑھا لکھّا کوئی مجہول ہو سکتا نہیں
جو زباں زوری کو اپنے علم کا سمجھے کمال
ایسا ضدّی آدمی معقول ہو سکتا نہیں

ایک شاعر اور نقلی نقّاد سے

تجھکو ہے مسرّت تو مجھے بھی ہے کہاں غم
دولت تری معبود، خودی ہے مرا مایہ

تو شاعرِ خوش گو ہے نہ نقّادِ ادب ہے
پوشیدہ نہیں میری نظر سے ترا پایہ

ہر بات سے ظاہر ہے ترا نقصِ نجابت
اسلوبِ اشارہ ہو کہ اندازِ کنایہ

گو نخلِ تعصّب کی جڑیں ہیں ترے دل میں
گفتار میں شاخیں ہیں نگاہوں میں ہے سایہ

ایک حقیقت

ناراض نہ ہو میری خموشی پہ خدارا!
مانا کہ ترے شعر کا ہر لفظ ہے محکم
ہاں ہاں تجھے از بر ہیں قوافی کے دفاتر
الفاظ کا اُڑتا ہے ترے ذہن میں پرچم
لیکن یہ نہیں شاعرِ فطرت کے علامات
اس کے تو ہیں کچھ اور ہی اوصافِ معظّم
موزوں جو طبیعت ہو تو ڈھل جاتے ہیں اشعار
نغمات کا افسوں بھی مسلّم ہے مسلّم
اشکوں میں تبسّم کو بھی غلطاں کبھی دیکھا؟
برسائی ہے شعلوں نے کبھی روح پہ شبنم؟

روندے ہیں کبھی انجم و مہتاب کے میداں
پایا ہے دو عالم کو کبھی روح میں مدغم
زنہار وہ صوفی ہے نہ شاعر ہے نہ درویش
دل جس کا نہیں جلوۂ کونین کا محرم

حسنِ زندگی

کیمیا سے ہے فزوں غم میں اگر خامی نہ ہو
عشق آتش، زندگی تانبا ہے، غم اکسیر ہے
مجھکو دلچسپی حیات آرائی میں ہے اسلئے
زندگی کی سعی بھی مرنے کی اک تدبیر ہے

مقامِ دوست

رُوح ناقص ہے تو اندوہ و علالت ہے حیات

رُوح کے جوہر درخشاں ہیں تو غم ناشاد ہے

میری کوشش کا نتیجہ الامان والحذر

عشق ہے تقدیر اور تدبیر بے بنیاد ہے

دو جہاں ڈھونڈھے تھے جس کو بھول جانے کے لئے

آج سب کچھ بھول بیٹھا ہوں مگر وہ یاد ہے

ہے محبّت، دولت و ادراک و منصب سے بلند

قدر کے قابل ہے جس دل میں کسی کی یاد ہے

حسن کا ایک حربہ

بجا کہ حسن کا افسوں ہے بے خطا لیکن

ازل سے عشق خود آگاہ بھی تو ہے آزاد

ہیں پیشِ حسن شعور و خرد کے آئینے

مگر جنوں کا تقاضا کہ ہر چہ بادا باد

عجیب شان سے گرمِ سفر ہیں دیوانے

نفس نفس ہے تشکّر، قدم قدم افتاد

جھکا ہی لیتی ہے اک دن غرورِ گردوں کو

زبان و لب کی خموشی، نگاہ کی فریاد

مگر کرم پہ جب احساسِ حسن آجائے

یہ جان لو کہ ہوا عشق ہر طرح برباد

روشنی

عشق کی دولت ہے کربِ جاوداں، سوزِ دوام
خواہشِ درماں اگر رکھتا ہے فِکرِ خام ہے
حُسن مضطر ہے حیاتِ عشق بننے کے لئے
اب اسے ناکام رکھنا آدمی کا کام ہے

نکات

خاک اس نکتہ کو سمجھیں گے مقاصد کے غلام
جذب ہو جانے کی حسرت کا محبّت نام ہے

مفلسوں کو دیکھ جن کا ہے یہ معیارِ حیات
جانثاری سے جو عاری ہے وہ شوقِ خام ہے

وہ محبّت ہر کس و ناکس کی قسمت ہیں کہاں
جس محبّت میں رقابت کا فسوں ناکام ہے

غم میں غم ہی کے اضافے سے مسرّت ہو تو ہو
ورنہ یہ دردِ محبّت پر کھلا الزام ہے

حاصلِ عصیاں

عشرتونکی دُھن میں جب آوارہ ہو جاتا ہے نفس
کیا بتاؤں کیا ارادوں کا مآلِ کار ہے
آ کے رُک جاتی ہے اس اک فیصلے پر زندگی
توبہ آساں ہے مگر ترکِ گُنہ دشوار ہے

وعدہ

کیا ہے میں نے عہدِ رازداری
مگر ہوتا نہ اس وعدہ پہ مغرورا
کہ انسان تنگ آ کر رازِ دل بھی
بتا دینے پہ ہو جاتا ہے مجبورا

ایک تاجر دوست سے

جانتا ہوں کہ بزمِ عالم میں
جس کا دِل مائلِ تجارت ہے

وہ ہے یکسر وفا سے بیگانہ
اُس کو کیا اس جنوں کی حاجت ہے

ہم تم اس طرح کیوں ہیں شیر و شکر
مجھکو حیرت ہے سخت حیرت ہے

اِس معمّے کا حل ہے کیا اے دوست
یہ تجارت ہے یا محبّت ہے؟

چراغِ تجربہ

جس کرب کے عالم کا اک نام محبّت ہے
ادراک کی لغزش ہے، احساس کی بیداری
جو بغض و حقارت میں تبدیل نہیں ہوتی
اس ڈھب کی وفاداری ملتی ہے بہ دشواری
اربابِ محبّت کی آنکھیں نہ سہی بینا
لیکن وہ سہارے کو کہتے ہیں گنہگاری
محبوب کی عظمت پر محبوب جو چھا جائے
ناقص ہے وہ محبوبی، دھوکا ہے وفاداری

حدیثِ محبّت

وفا ہے خام، محبّت کی تربیت ناقص
اگر نصیب نہ ہیں مشکلوں کا گہوارہ

حیات لذّتِ معصوم ہے محبّت میں
اگر نہیں، تو محبّت ہے خام و ناکارہ

جس انتظار کی تخلیق بدگمانی ہے
وہ انتظار ہے، مرگِ وفا کا ہرکارہ

زہے جنونِ محبّت، کہ ہے تو، بدبختی
مگر نہیں ہے تو ہستی غموں کا پشتارہ

دلِ بصیر کا مرکز بدل نہیں سکتا
نظر ہو لاکھ زمانے کے ساتھ آوارہ

علامت

تکلّف اور دعوائے دوستی کا — نہیں یہ دوستی ہرگز نہیں ہے

تعلّق ہے اگر مقصد کی بنیاد — وہ بے بازو کی خالی آستیں ہے

مگر اُلفت اگر ہے وجہِ اُلفت — تو دنیا رشکِ فردوسِ بریں ہے

یہاں مقصد کی گنجائش ہے لیکن

وہاں اُلفت کی گنجائش نہیں ہے

تاثراتِ مایوسی

احساں وہ حد سے کھنچ گئے ہیں
تسکین کا اب کہاں ٹھکانا

راس آئے گا خاک مجھکو یہ شہر
آیا نہ غرض کا گیت گانا

ہے حسن یہاں خود اپنا دلّال
اور عشق کی روح شاطرانہ

نازاں ہیں غلام پستیوں پر
ہر سر ہے برائے آستانہ

ہر دل ہے مزارِ مہر و اُلفت
ہر آنکھ ہے گردشِ زمانہ

زینت ہیں قفس کی اہلِ پرواز
ہے جرم بلند آشیانہ

تقدیسِ وفا ہے نقصِ تہذیب
مقصد ہے خودی کا سر جھکانا

دل کھنچتا ہے سوئے خاکِ دہلی
ڈر ہے کہ نہ روک لے زمانا

اے کاش وہ اب نہ یاد آئے
ممکن نہیں جس کو بھول جانا

غزل

عشق گر ہے رابطۂ روح جسم سے انبساط کیوں
یعنی تری نگاہِ شوق نازکشِ نشاط کیوں

حدِّ تکلفات تک پردہ بہ پردہ تھے فریب
ان سے گذر گیا تو پھر خطرۂ اختلاط کیوں

میں ہوں اسی خیال سے گمشدۂ تحیرات
عشق اگر ہے جاوداں حسن ہے بے بساط کیوں

تیرے اور اُس کے درمیان اب بھی ہے کچھ حجاب اگر
ماتمِ ارتباط کر! نازشِ ارتباط کیوں

پہلے ہی دوستی میں جب اُٹھ گئے پردہ ہائے دل
پھر تجھے گفتگو میں ہے حاجتِ احتیاط کیوں

غزل

غنچوں کی چٹک، پھولوں کی مہک، ذرّوں کی ضیا، شاخوں کی لچک
جلوت سے بشر دیوانہ ہے، خلوت کے مظاہر کیا ہوں گے

انسان کی ہستی ختم نہیں اجسام کی حادث دنیا تک
جو رُوح سے یکسر مُنکر ہیں آگاہِ عناصر کیا ہوں گے

بحرِ راہِ تخیّل بستے ہیں سائنس کی بازی گاہوں میں
ناکام جو ہیں تدبیروں میں تقدیر کے ماہر کیا ہوں گے

صیّاد و قفس سے لرزاں ہیں تزئینِ چمن کے متوالے
بجلی پر جو برسوں جھُول لیے ہوں خاموش وہ طائر کیا ہوں گے

لاہور کے اکثر اہلِ ادب تہذیب نوی پر مائل ہیں
احسان سے جو بیگانہ ہیں اللہ کے شاکر کیا ہوں گے

پیمانہ

شامِ غم کے لئے، تاریکیٔ حرماں کے لئے
کون کہتا ہے تلاشِ مہ و پروین نہ کر

نہیں ہر شخص کا حصّہ نظر و ظرف و ضمیر
لذّتِ سوز اُٹھا! عشق کی تلقین نہ کر

شوق شرمندۂ پیمانہ اور اک نہیں
عصمتِ درد کو آلودۂ تخمین نہ کر

جسم بے دین بھی اچھا نہیں لیکن اے دوست
کُفر کو کفر سمجھ رُوح کو بے دین نہ کر

جو نہ بشر سے کو پڑھے، جو نہ نگاہوں کو سُنے
اس کے آگے کبھی الفاظ کی توہین نہ کر

محبّت کا ایک مقام

ضبطِ غمِ الفت کا اثر دیکھ رہا ہوں
اِس بحر میں ہیں نالہ و شیون خس و خاشاک
اِس راہ میں رفتار بدل دی ہے جنوں نے
اِس جادۂ دشوار پہ چلتا نہیں ادراک
اب عشق ہے اور حُسن کا پگھلا ہُوا سوتا
ہونٹوں پہ تبسّم بھی ہے آنکھیں بھی ہیں نمناک
ہیں عشق کو درپیش وہ جانکاہ مراحل
دوری بھی خطرناک حضوری بھی خطرناک

حدیثِ حیات

رہِ وفا میں راہرو کو کارواں سے کام کیا
جو خود ہو آفتاب اُس کو کہکشاں سے کام کیا

کمالِ شوق دو جہاں سے بے نیاز چاہیے
تجھے یہاں کی فکر کیوں تجھے وہاں سے کام کیا

زمانہ امتحانِ ضبط لے رہا ہے لے مگر
ترے جنونِ شوق کو اس امتحاں سے کام کیا

نہ دیکھ مُڑ کے بار بار ماضیٔ جمیل کو،
یہ خوابِ رائیگاں ہے خوابِ رائیگاں سے کام کیا

جو انجمن ہو صرفِ ماتمِ نشاط و بیخودی
اُس انجمن سے کیا لگاؤ نوحہ خواں سے کام کیا

تری نظر تو حادثاتِ زندگی پہ چھا ہے
تجھے فضائے کامگار و کامراں سے کام کیا

ہے میر کارواں تو فکرِ کارواں غلط نہیں
نہیں ہے کارواں تو نظمِ کارواں سے کام کیا

تو وہ عقاب ہے کہ تجھ سے زلزلے میں ہیں قفس
ترے اصولِ زندگی کو آشیاں سے کام کیا

تری زمیں کا ذرّہ ذرّہ آفتاب ساز ہے
تری زمیں کو آفتابِ آسماں سے کام کیا

نہیں سجودِ شوقِ تاجِ خسروی کیواسطے
جبینِ بندگی کو تاجِ خسرواں سے کام کیا

تمت

چھپا [illegible] پریس میں باہتمام احسان دانش پرنٹر و پبلشر مکتبۂ دانش و دانشگاہ پنجاب مزنگ لاہور چھپ کر شائع ہوا